محمد حسین آزاد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محمد حسین آزاد

نند کشور وکرم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1982
تیسری طباعت	:	2010
تعداد	:	550
قیمت	:	-/14 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	284

Mohammad Hussain Azad

by

Nand Kishor Vikram

ISBN :978-81-7587-359-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

فون نمبر: 49539000، فیکس 49539099

ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

سوانحی حالات	5
عادات وخصائل	26
آزاد بحیثیت نثر نگار	31
تصنیف وتالیف	36
آزاد کی نثری کتابوں سے چند اقتباسات	47
آزاد بحیثیت شاعر	
منتخب کلام	
کتابیات	

سوانحی حالات

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کی ولادت[1] 17 ستمبر 1829ء (بمطابق 18 ربیع الاوّل 1245ھ) کو دہلی میں ہوئی۔ اُن کے والد مولوی محمد باقر کا شمار شہر کے ممتاز علما و ادبا میں ہوتا تھا اور انھیں دہلی سے پہلا "اُردو اخبار" نکالنے کا فخر حاصل تھا۔

آزاد کے اجداد میں مولانا محمد شکوہ شاہ عالم کے دَورِ حکومت میں نقلِ مکانی کر کے ہمدان سے دہلی آئے تھے۔ اُن کے پر دادا محمد اشرف اور دادا مولانا محمد اکبر دہلی کے نامی گرامی مجتہد تھے اور انھوں نے اپنے گھر میں دینی علوم کا مدرسہ قائم کیا ہوا تھا، جہاں دُور دراز سے طلبا آکر دینی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ ان کی شادیاں ایرانی خواتین سے ہوئی تھیں۔ محمد اکبر تک سب کی گھریلو زبان فارسی تھی۔ اِنھی محمد اکبر کے بیٹے محمد باقر تھے۔

ابتدا میں آزاد کے والد نے بھی اِسی مدرسے میں تعلیم پائی، لیکن بعد میں وہ کابلی دروازے میں واقع میاں عبدالرزّاق کی درس گاہ میں داخل

---

[1] محمد حسین آزاد کے ملازمت اور پنشن کے جو کاغذات محفوظ ہیں اُن کی رُو سے تاریخِ ولادت 5 رجولائی 1835ء ہے اور اُن کے بیٹے کا بیان ہے کہ جون 1830ء میں پیدا ہوئے تھے۔

ہو گئے جسے اُن دِنوں قرب و جوار میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ اسی مدرسے میں تعلیم کے دَوران اُن کی دوستی شیخ ابراہیم نامی ایک طالبِ علم سے ہوئی جو بعد میں دنیائے شاعری میں ذوق دہلوی کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ کئی برسوں تک یہ دونوں طلبار ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے اور اِس دوران ان کی دوستی اتنی مستحکم ہوگئی کہ زمانے کے حوادث کا بھی اس پر کوئی اثر نہ پڑا۔

دینی اور مروّجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولوی محمد باقر دہلی میں ناظرِ عدالت کے عہدے پر مامور ہو گئے، لیکن وہ اِس عہدے پر زیادہ عرصے تک فائز نہ رہے، والد نے استعفا دلا دیا تھا تاکہ انھیں اپنا جانشین بنا سکیں اور یہ مجتہد کی حیثیت سے مذہبی خدمت کریں۔ لیکن بعد میں دہلی کے شیعوں میں دو گروہ بن گئے ایک جماعت کے رہنما محمد باقر تھے اور دوسری کے جعفر علی موخر الذکر کو دربار شاہی کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اور ملازمت سے استعفا دے کر اپنے والد کے مشورے پر مذہبی علوم کی تعلیم و ترویج میں لگ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے 'مطبع جعفریہ' کے نام سے ایک پریس قائم کیا جس کا نام بدل کر بعد میں 'اُردو اخبار پریس' کر دیا گیا۔ اسی پریس سے 1836ء میں انھوں نے دہلی کا پہلا ہفت روزہ 'اُردو اخبار' شائع کیا۔

مولوی محمد باقر نے اپنے مطبع کے لیے ایک بڑا سا مکان تعمیر کرایا تھا جس میں پریس کے علاوہ اُن کا مدرسہ اور کتب خانہ بھی تھا، اپنے مکان کے قریب ہی مولانا نے ایک بہت بڑا احاطہ تعمیر کرایا جس کے چاروں طرف کوٹھریاں اور بیچ میں ایک بڑا صحن تھا۔ ان کوٹھریوں میں باہر سے آئے ہوئے تاجر قیام پذیر ہوتے تھے اور اپنے مال کی نمائش و فروخت کرتے تھے۔ اس احاطہ کو 'نیلام گھر'

کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

جب آزاد کی ولادت ہوئی تو اُن کے والد کے دوست اور مشہور شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوق نے 'ظہور اقبال'[1] تاریخ کہی اور محمد حسین نام رکھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اور پھر 'دہلی کالج' میں داخل ہوئے، اور علوم مروجہ میں تعلیم حاصل کی۔ دہلی کالج میں اُن دنوں اور بھی بہت سے ایسے طالب علم زیرِ تعلیم تھے جو بعد میں اُردو ادب کے معماروں میں شمار ہوئے جیسے مولوی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب وغیرہ۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انھوں نے اخبار اور پریس کے کاموں میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ اُن کے زورِ قلم اور اسلوبِ تحریر کی وجہ سے یہ اخبار تھوڑی مدت ہی میں عوام میں بے حد مقبول ہوگیا۔ اخبار میں وہ اکثر ایسٹ انڈیا کمپنی پر تنقید کیا کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب 1857 میں مغل سلطنت کے خاتمے کے بعد انگریزی حکومت قائم ہوئی تو اُس نے اخبار کی تمام کاپیاں ضبط کرلیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کے گھروں میں بھی کاپیاں تھیں انھوں نے بھی حکومت کے خوف سے انھیں نذرِ آتش کردیا۔

آزاد کو شعر و ادب کا بھی شوق تھا لہٰذا شاعری میں انھوں نے اپنے والد کے عزیز دوست اور اُس دور کے مشہور شاعر خاقانیِ ہند محمد ابراہیم ذوقؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ وہ روزانہ اخبار اور پریس کے فرائض سے فارغ

---

(1) " 18 ربیع الاول کو مولانا محمد باقر کو خداوند تعالیٰ نے ایک فرزند عطا کیا۔ ان کے دلی دوست شیخ ابراہیم ذوق نے 'ظہور اقبال' تاریخِ پیدائش کہی محمد حسین نام رکھا۔" (نقوش لاہور شخصیات نمبر صفحہ 15) "ظہورِ اقبال" سے اعداد م 1245 برآمد ہوتے ہیں۔

ہو کر بعد عصر اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور رات گئے تک اُن کی خدمت میں رہ کر استفادہ کرتے اور یہ وضعداری جب تک وہ بقید حیات رہے قائم رہی۔ نومبر 1854ء میں استاد کی وفات کے بعد انھوں نے حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینی شروع کی۔ پھر 1857 کے ہنگامے سے تھوڑے ہی دنوں بعد آغا جان عیش کا بھی انتقال ہو گیا۔

آزاد کو اپنے اُستاد حضرت ذوق دہلوی سے بڑی عقیدت تھی، وہ چاہتے تھے کہ اُن کے دیوان کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیں مگر وائے قسمت ابھی انھوں نے اِس کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا تھا کہ 1857ء کے ہنگامے نے دہلی والوں پر قیامت برپا کر دی اور سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ اس خونیں واقعے اور دیوانِ ذوق کی ترتیب میں تعطل کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے آبِ حیات میں یوں لکھا ہے:

"اُستاد کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ سب ذخیرہ نکالا، محنت نے اِس انتخاب میں پسینے کی جگہ لہو ٹپکایا، کیوں کہ بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک کا کلام انھیں میں تھا اور بہت سی غزلیں، بادشاہ کی بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں .... چنانچہ اوّل ان کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لیے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر باطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ حسرتوں کے خون بہ جائیں گے، دِل کے ارمان دل میں رہ جائیں گے۔ دفعتاً 1857ء کا

غدر ہوگیا۔کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا،چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل اُن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی اُن کے فرزند روحانی بھی دُنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتح یاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی۔ یہ ہی خیال آیا کہ محمد حسین! زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائےگا مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آکر کہیں گے اب اُن کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جُنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا، ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے، دِلّی ایک بہشت ہے انہی کا پوتا ہوں کیوں نہ نکلوں "

1857ء کے ہنگامے میں آزاد کے والد [1] مولانا محمد باقر کو بھی انگریزی حکومت نے گرفتار کر کے دہلی دروازے کے باہر میدان میں دوسرے حب الوطنوں کے ساتھ محصور کر دیا تھا جہاں اُن سے کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی۔ تاہم آزاد کو اپنے والد کے ایک سکھ دوست کا خیال آیا جو فوج میں جرنیل تھا۔ وہ ان کے پاس گئے اور مدعا بیان کیا۔ پہلے تو اُس نے اس خطرناک ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہ مانے

---

(1) دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر مولوی محمد باقر کے دوست تھے اور ان کی ترغیب سے ہی محمد حسین آزاد کو دہلی کالج میں داخل کیا گیا تھا۔ انھوں نے 1857ء میں مولوی محمد باقر کے امامباڑے میں پناہ لی تھی لیکن ہندستانی سپاہیوں نے انھیں وہاں سے نکال لیا اور قتل کر دیا۔ اِس جرم میں مولوی محمد باقر ماخوذ ہوئے۔

تو سائیس کا لباس پہنا کر انھیں خونی دروازے کے سامنے میدان میں لے گیا جہاں شہر کے عمائدین محصور تھے اور جنہیں گولی سے مار دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ آزاد نے اُن ہی محصور معززین میں اپنے والد کو بھی دیکھا جو اس وقت نماز پڑھنے میں منہمک تھے۔ وہ کئی لمحے تک بہ حسرت و یاس ٹکٹکی باندھے اپنے والد کو دیکھتے رہے۔

جب نماز پڑھ کر اُن کے والد فارغ ہوئے تو اچانک اُن کی نظر اپنے اکلوتے لختِ جگر پر پڑ گئی۔ نظر چار ہوتے ہی انھوں نے اپنے فرزند ارجمند کو اشارے سے فوراً وہاں سے چلے جانے کو کہا کہ کہیں وہ بھی دشمنوں کے ہاتھوں نہ پڑ جائے اور اس کا حشر بھی اُن کی طرح نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ آزاد والد کا اشارہ سمجھ گئے اور چونکہ وہاں زیادہ دیر کھڑا رہنا خطرے سے خالی نہ تھا، لہٰذا چار و ناچار وہ وہاں سے واپس چلے آئے اور اس واقعہ کے دو چار دن بعد انھوں نے سُنا کہ اُن کے والد کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا ہے۔

والد کی وفات کا انھیں بے حد غم تھا لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے؛ اُس وقت تو ہر شخص کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے لہٰذا وہ بھی اپنی جان بچا کر تنِ تنہا دہلی اور اہلِ دہلی پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے کسی نامعلوم منزل کی جانب چل پڑے تاکہ اپنی زندگی کو خطرے سے دور لے جا سکیں۔ اُس وقت نہ ان کے پاس روپیہ پیسہ تھا اور نہ ہی سنگی ساتھی۔ کیونکہ وہ اپنے اہلِ خاندان کو اپنے اخبار کے ایک خوشنویس امداد حسین کے ساتھ سونی پت بھیج چکے تھے تاکہ وہ دہلی میں انگریزوں کی بربریت اور مظالم کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔ اُس وقت اُن کے پاس اپنے اُستاد کے کلام کے مُلیندے کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب وہ گٹھری اُٹھائے جمنا کے پُل کے نزدیک پہنچے تو ایک گورے سپاہی نے انھیں پکڑ لیا اور سنگین سے گٹھری اُتار کر دُور پھینک دی جس سے تمام کاغذات اِدھر اُدھر

منتشر ہو گئے۔ گورے نے جب دیکھا کہ گٹھری میں سیم وزر کے بجائے بیکار کاغذ ہیں تو اُسے بڑی مایوسی ہوئی اور بولا : بھاگ جاؤ۔ مولانا نے جلدی جلدی منتشر کاغذات اکٹھے کئے اور اُن کا پلندہ سر پر رکھ پا پیادہ لکھنؤ کی جانب چل پڑے۔ اُس وقت اُن کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی لہٰذا راستے میں جگہ جگہ محنت مزدوری سے اپنے قیام و طعام کا انتظام کرتے آخر کئی مہینوں کے بعد سراؤں اور مسجدوں میں رات بسر کرتے وہ اودھ کی راجدھانی لکھنؤ پہنچے جسے وہ برسوں سے دیکھنے کے متمنی تھے۔ لکھنؤ میں وہ زیادہ عرصے تک قیام نہ کر سکے، تاہم اپنے مختصر قیام کے دوران انھوں نے وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں کیں اور انیس و دبیر کے معرکے بھی دیکھے. علاوہ بریں انھوں نے میر تقی میر کے بیٹے میر کلو عرش سے ملنے کا شرف بھی حاصل کیا۔

لکھنؤ میں انھیں پہنچے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ انھیں اطلاع ملی کہ انگریز سرکار نے ان کی گرفتاری کے نہ صرف وارنٹ جاری کر دیے ہیں بلکہ گرفتار کرانے والے کے لیے پانچ سو روپے کا نقد انعام بھی مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بڑے پریشان ہو اُٹھے کیونکہ لکھنؤ میں انھیں بے شمار لوگ جانتے تھے اور اُن میں سے کوئی بھی روپے کے لالچ میں انھیں گرفتار کرا سکتا تھا لہٰذا اُن کے لیے لکھنؤ میں ایک پل بھی ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ اب انھوں نے سوچا کہ وہ کہاں جائیں ؟ شمالی ہند میں تو ہر جگہ اُن کے جانکار موجود تھے۔ آخر کافی غور و خوض کے بعد انھوں نے دکھن کی طرف جانا بہتر سمجھا کیوں کہ وہاں کسی واقف کار یا جاننے والے کے ملنے کا خدشہ نہ تھا۔ اور پھر کئی مہینوں کے سفر کے بعد وہ مدراس پہنچے اور وہاں نیل گری کے ملٹری اسکول میں بحیثیت

استاد ملازم ہو گئے، وہاں انھوں نے لگ بھگ چھ ماہ ملازمت کی پھر وہاں سے مہاراشٹر کی راجدھانی بمبئی پہنچے۔ یہاں اپنے قیام کے دوران انھوں نے فارسی زبان و ادب کے مطالعے و تحقیق کے شوق میں پارسیوں کے مذہبی صحیفے اور زبان کا بھی بغور مطالعہ کیا۔

بمبئی میں بھی اُن کا قیام بڑا مختصر رہا اور جلد ہی بمبئی کو خیرباد کہہ کر وہ پنجاب کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں وہ مالوہ اور دوسرے شہروں میں بھی چند دن رُکے اور آخر تقریباً پونے دو سال بعد فروری 1859ء میں وہ پنجاب کی ریاست 'جیند' پہنچے، مہاراجا جیند نے شاعری کی مد میں کچھ انعام و اکرام سے بھی نوازا اور آزاد سنگرور کے محکمہ فوجداری میں ملازم ہو گئے۔ یہ ملازمت انھوں نے لگ بھگ دس مہینے تک انجام دی۔ اس کے بعد نومبر 1859ء میں لدھیانہ ضلع کے قصبہ جگراؤں آگئے جہاں سے علومِ دینی میں ان کے والد کے شاگرد "ارسطو جاہ خان بہادر سید رجب علی" "مجمع البحرین" نامی اخبار شائع کرتے تھے اور آزاد کے بڑے معترف و معتقد تھے۔ لیکن اُس وقت مولانا اتنی خستہ حالت میں تھے کہ ارسطو جاہ انھیں پہچان نہ سکے۔ تاہم اُنھیں پریس میں ملازمت مل گئی اور ارسطو جاہ کے بچوں کو بھی پڑھانے لگے اور پھر یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اُن کے اُستاد زادے محمد حسین ہیں، بڑی عزت و توقیر کی اور اصرار کیا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی یہیں بلا لیں۔ اس وقت تک مولانا کو اپنی بیوی بچوں کے بارے میں کچھ خبر نہ تھی کہ وہ سونی پت میں کس حالت میں ہیں۔ انھوں نے خط لکھ کر اُنھیں اپنی خیر و عافیت سے آگاہ کیا۔ اس وقت تک اُن کے گھر والوں کو بھی ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہ تھی اور وہ اُن سے مایوس سے ہو گئے تھے۔ کیونکہ دہلی کے ہنگاموں میں انگریزوں نے ہزاروں بے گناہ اور معصوم افراد کو تہِ تیغ کر دیا تھا یا گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔

یہ ارسطو جاہ، لفٹنٹ گورنر پنجاب کے میر منشی تھے اور انگریزوں کے خاص وفادار تھے اس کے لیے انھیں جاگیر وغیرہ بھی ملی تھی۔

جب مولانا کا خط سونی پت پہنچا تو گھر والوں کو ناقابلِ بیان خوشی ہوئی۔ اُن کی سلامتی کی خوش خبری سُن کر نذریں نیازیں دی گئیں اور پھر کچھ عرصے بعد وہ لوگ بھی جگراؤں چلے آئے جہاں مولانا نے پریس میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ یہاں پہنچنے پر ارسطو جاہ نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی اور جب تک یہ لوگ جگراؤں میں قیام پذیر رہے اُنھیں اپنے ہاں رکھا اور اُنھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دی۔

اُن دِنوں مولانا کے بہنوئی سیالکوٹ میں پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے، لہٰذا وہ اُن سے ملنے کی غرض سے کچھ عرصے کے لیے سیالکوٹ چلے گئے۔ اور چونکہ پنجاب کا یہ شہر ریاست جموں وکشمیر کی سرحد پر واقع تھا لہٰذا وہ سیر وسیاحت کی غرض سے کشمیر چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد جب وادیِ کشمیر کی سیر کرکے واپس سیالکوٹ آئے تو نادر و نایاب کتابوں کی تجارت شروع کردی۔ وہ بذریعہ خط وکتابت بڑے بڑے افسروں اور کتابوں کے قدر دانوں کو اطلاع دیتے تھے کہ اُن کے پاس فلاں فلاں کتاب فروخت کے لیے دستیاب ہے لیکن ان کا یہ کاروبار بھی بڑے مختصر عرصے تک رہا کیونکہ اُن کے بہنوئی کا تبادلہ وہاں سے لاہور ہوگیا اور وہ بھی اُن کے ساتھ سیالکوٹ سے لاہور چلے آئے۔

لاہور میں اُن دِنوں اُن کے والد کے شاگرد ارسطو جاہ گورنر پنجاب سر ہنری لارنس کے میر منشی تھے اور فارسی خط وکتابت اُن کے سپرد تھی۔ ارسطو جاہ نے اس کام پر مامور کردیا مگر وہ زیادہ عرصے تک یہ خدمت انجام نہ دے سکے کیونکہ کچھ عرصہ محکمۂ ڈاکخانہ میں بلا تنخواہ کام کرنے کے بعد ۱۹ راپریل 1861ء کو انھیں محکمہ ہذا کے ڈیڈ لیٹر آفس میں ڈاک خانے کے اشتہارات اور اعلانات

کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے تیس روپے ماہوار پر ملازم رکھ دیا گیا۔ پھر بطور ساوور سیر اُن کا تبادلہ ملتان کر دیا گیا، لیکن چونکہ وہ لاہور سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے، لہٰذا زیادہ تنخواہ ہونے کے باوجود انھوں نے اس ملازمت سے استعفا دے دیا۔

اگرچہ انھوں نے لگ بھگ دو برس تک محکمہ ڈاک میں ملازمت کی تھی لیکن اس قلیل مدت میں ہی اُن کے علم و ذہانت سے پوسٹ ماسٹر جنرل بہت متاثر ہوا تھا۔ جب وہ کسی طرح تبادلہ پر ملتان جانے پر رضامند نہ ہوئے اور انھوں نے استعفا دے دیا تو پوسٹ ماسٹر جنرل نے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر میجر فلر کے نام انھیں ایک سفارشی خط دیا جس میں اُن کی علمیت و ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے انھیں محکمہ تعلیم کے لیے موزوں شخص قرار دیا گیا تھا۔

یہ سفارشی خط لے کر مولانا ڈائرکٹر تعلیم میجر فلر کے پاس پہنچے۔ لیکن میجر فلر انھیں پہلے ہی سے جانتا تھا اور ان کی علمیت کا قائل تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ لدھیانہ میں اُن سے ملاقات کر چکا تھا۔ نیز وہ شکشا سبھا لاہور کی انجمن تعلیم لڑکیوں کے لیے ایک کتاب " آئینہ تعلیم " مرتب کر چکے تھے اور فلر نے نہ صرف اُسے پسند کیا تھا بلکہ اس پر انعام دلوانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ خوش قسمتی سے اُن دنوں محکمہ تعلیم میں اہلمد کی ایک آسامی خالی تھی لہٰذا انھیں اس عہدے پر فائز کر دیا گیا جس سے اُن کی علمی و ادبی زندگی کی ابتدا ہوئی جس کا وہ برسوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔

محکمہ تعلیم میں اُن کی ملازمت کا آغاز یکم جنوری 1864ء سے ہوا۔ تنخواہ 35 روپیہ تھی، پہلے نائب سررشتہ دار ہوئے پھر محرر۔

اِس سلسلے میں حامد حسن قادری نے داستانِ تاریخ اُردو میں یوں تحریر کیا ہے:

• پنڈت من پھول میر منشی لفٹنٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپے کے ملازم ہوگئے۔ اس زمانے میں میجر فلر ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ میجر صاحب بڑے علم دوست تھے اور ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی سے خاص اُنس رکھتے تھے۔ آزاد اور ماسٹر صاحب کے تعلقات نہایت دوستانہ و مخلصانہ تھے۔ آزاد نے ماسٹر صاحب سے فرمایش کی کہ میجر صاحب سے ہمیں بھی ملوا دیجیے۔ ایک بار موقع مل گیا میجر فلر نے کوئی اُردو کی تحریر لکھی تھی، وہ ماسٹر صاحب کو دکھائی، اُس میں میجر صاحب نے ایجاد کو مونث لکھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اعتراض کیا کہ "ایجاد" مذکر ہے۔ میجر صاحب نے کہا کہ یہ تحریر مولوی کریم الدین سررشتہ دار کو دکھالی ہے' مولوی صاحب بلائے گئے انھوں نے اعتراض سُن کر کہا کہ مذکر بولنے کی سند درکار ہے۔ ماسٹر پیارے لال صاحب نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے محکمہ میں جو مولوی محمد حسین دہلوی ہیں ان کو بہت سے شعر یاد ہیں۔ میجر نے آزاد کو بُلا کر سوال کیا۔ آزاد نے فوراً سودا کا یہ شعر پڑھا ؎

ہائے کس بھڑوے کا یہ ایجاد ہے
نسخہ میں معجون زر انبا د ہے

میجر صاحب بہت خوش ہوئے اور آزاد کی قدر کرنے لگے۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر ہوئے۔ اُس زمانے میں لاہور سے ایک سرکاری اخبار "اتالیق پنجاب" نکلتا تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اس کے ایڈیٹر تھے، کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اس اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا اور 75 روپیہ تنخواہ کر دی، پھر "اتالیق پنجاب" بند کر کے

اس کی جگہ "پنجاب میگزین جاری ہوا تو آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر رہے۔"

1864ء میں 'انجمن پنجاب' کا قیام عمل میں آیا جس میں مولانا نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا[1]۔ اس سوسائٹی میں دل چسپی کی وجہ سے وہ اس کے سکریٹری متقرر کر دیے گئے۔ اور جب انجمن کا رسالہ 'مطالب مفید' اشاعت پذیر ہوا تو انھیں اُس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ اُن کی اَن تھک کوششوں سے انجمن کے رسالے اور انجمن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور تھوڑی سی مدت ہی میں انجمن کی شاخیں بہت سے دوسرے شہروں میں بھی کھل گئیں، اور رسالے کی مانگ بھی تمام ملک میں ہونے لگی۔ اِس انجمن نے جگہ جگہ مدرسے بھی قائم کیے اور مشرقی تعلیم و تدریس کا اہتمام بھی کیا۔ اس نے امتحان لےکر باقاعدہ سندیں بھی عطا کیں اور ذہین طلبا کو وظیفے بھی دیے۔ جس سے اس کی حیثیت ایک یونیورسٹی کی سی ہو گئی اور اس کا شہرہ غیر ممالک میں بھی پھیل گیا۔ بعد میں اس درس گاہ نے پنجاب یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔

مولانا نے انجمن کے تحت ایک مشاعرے کا سلسلہ بھی شروع کیا جو بہت کامیاب ثابت ہوا۔ یہ مشاعرہ انجمن کے جلسے کے خاتمے پر منعقد ہوتا تھا اور اس میں دو طرحی مصرعے ہوتے تھے ایک اُردو کا اور دوسرا فارسی کا۔ مشاعرے میں جس ترتیب سے کلام پڑھا جاتا تھا اُسی ترتیب سے رسالے کے آخر میں شائع کیا جاتا تھا۔

1865ء میں انگریز سرکار نے پنڈت من پھول میر منشی کی معیت میں

---

[1] ماسٹر پیارے لال آشوب اس کے میگزین ایڈیٹر تھے اور آزاد سب ایڈیٹر۔ اُن کی جگہ پر بعد کو مولانا حالی کا تقرر ہوا تھا۔

وسطی ایشیا کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لیے جو ایک وفد وہاں بھیجا تھا مولانا بھی اُس کے ایک اہم رُکن تھے۔ یہ سفر اتنا دشوار اور پُر خطر تھا کہ وفد کے دو رکن راستے ہی سے لوٹ آئے لیکن مولانا کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہوئی اور وہ علمی تحقیق و جستجو کے ذوق و شوق میں آگے ہی بڑھتے رہے۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں کی زبان ادب اور تہذیب و تمدن سے واقفیت حاصل کی۔ انھوں نے افغانستان میں پشتو اور روس میں ترکی سیکھی۔ اس سفر کے دوران کئی بار انھیں دشواریوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ کہیں انھیں کافر سمجھ کر قتل کا فتویٰ صادر ہوا اور کہیں انگریزوں کا جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا گیا لیکن ہر جگہ کسی نہ کسی ترکیب و تدبیر سے وہ بچ گئے اور آخر تقریباً آٹھ مہینے کے جاں کاہ سفر کے بعد وہ لاہور پہنچے اور کچھ مدت وہاں قیام کرنے کے بعد کلکتہ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

کلکتہ میں قیام کے دوران وہ بہت سے ممتاز شعرا و ادبا سے ملے اور انھوں نے متعدد مدرسوں اور مکتبوں کا معائنہ کیا، نیز کئی نادر و نایاب کتب بھی خریدیں۔

کلکتہ سے واپسی کے بعد مولانا نے تاریخ اُردو اور شعرائے اُردو پر لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مضامین نہ صرف انجمن

لہ وسطِ ایشیا کے ملکوں کا یہ سفر 23 رجولائی 1865ء کو شروع ہوا تھا اور 27 مارچ 1866ء کو آزاد واپس آگئے تھے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد وہ اورینٹل کالج لاہور میں عربی اور ریاضی کے استاد مقرر ہوئے اور تقریباً ایک سال تک ﷺ 7 روپیہ ماہوار پر گورنمنٹ سینٹرل بُک ڈپو میں مترجم بھی رہے، جولائی 1869ء سے ؛. وہ گورنمنٹ کالج کی سروس میں آگئے۔ 6 فروری 1887ء کو مولوی فیض [illegible]سن سہارنپوری کے انتقال کے بعد وہ شعبۂ عربی کے صدر بنا دیے گئے تھے۔

کے جریدے کے شماروں میں شائع ہوئے بلکہ متعدد دوسرے رسائل وجرائد نے بھی انھیں نقل کیا۔ درحقیقت یہی مضامین آگے چل کر "آبِ حیات" ایسی شہرہ آفاق کتاب کی بنیاد بنے۔

1867-69ء کا عرصہ انھوں نے بچوں کے لیے اُردو ریڈر مرتب کرنے میں صرف کیا۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری جریدے "ہمارے پنجاب" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 1869 میں حکومت نے انھیں گورنمنٹ کالج میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا، ڈیڑھ سو روپیے ماہانہ تنخواہ ہوئی، حالانکہ دوسرے اساتذہ کا صرف پچاس ساٹھ روپیے ماہوار پر تقرر کیا گیا تھا۔

8 مئی 1874ء کو اُن کی قیامگاہ پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس نے نیچرل شاعری کی بنا ڈالی۔ اِس مشاعرے میں انھوں نے اُردو شاعری پر ایک پُر مغز تقریر کی جس میں عشقیہ شاعری کی قباحتوں کو بیان کرتے ہوئے شعراء کو نیچر کی شاعری کی جانب رجوع کرنے کی ترغیب دی۔ تقریر کے بعد انھوں نے حوالے کے طور پر "مثنوی شب قدر" پڑھی جس میں شام کی آمد اور رات کی کیفیت نظم کی گئی تھی۔ اس نظم کو حاضرین نے بےحد پسند کیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ہر مہینے شعراء حضرات کو کوئی عنوان دے دیا جائے اور وہ اس پر طبع آزمائی کریں۔ اِس مشاعرے کا گیارہ مہینے تک انعقاد ہوتا رہا اور اس دوران اس کی بڑے زور شور سے مخالفت بھی کی گئی تاہم اِس مشاعرے نے اُردو میں نیچرل شاعری کی تخم ریزی کردی جس نے بعد کو ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرلی۔

مولانا کو اپنا آبائی وطن ایران دیکھنے کی شروع سے بڑی خواہش تھی پھر جب انھوں نے "لغتِ آزاد" اور "سخندانِ فارس" لکھنے کا ارادہ کیا تو یہ شوق اور بھی بڑھ گیا مگر مصروفیت کی وجہ سے سفر کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اُن ہی دِنوں اُن کی

نو بیاہتا اور عزیز از جان بیٹی کا انتقال ہوگیا۔ اس صدمۂ جانکاہ سے اُن پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی کیونکہ اپنی اس دختر عزیز کو انھوں نے بڑی محنت و جانفشانی سے تعلیم و تربیت دی تھی اور وہ تصنیف و تالیف میں بھی اُن کی بہت مدد کرتی تھی۔ اس صدمۂ عظیم کو وہ لاکھ کوشش پر بھی بھلا نہ پاتے تھے لہذا انھوں نے سوچا کہ ایران کی سیر و سیاحت کی جائے شاید اس سے وہ اس سانحۂ ارتحال کو فراموش کر سکیں۔ دوستوں اور عزیزوں نے لاکھ منع کیا مگر انھیں اس ارادے سے باز نہ رکھ سکے اور وہ کالج سے طویل رخصت لے کر ستمبر 1885ء میں ایران روانہ ہوگئے اور لگ بھگ ایک برس تک ایران میں گھومتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے شدید سردی کے باوجود ایران کے مختلف شہروں اور قصبوں کی سیاحت کی اور اپنی تصنیف "سخندانِ فارس" کو مکمل کیا۔ علاوہ بریں انھوں نے اس زمانے میں ایران میں رائج فارسی زبان سے متعلق ایک کتاب لکھی اور پھر وہاں سے تقریباً دس ہزار روپے کی بیش بہا کتابیں خرید کر جولائی 1886ء میں واپس لاہور آگئے۔ اُن کی آمد پر ادبا و اقربا نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں دور دراز سے لوگ شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں انھوں نے اپنی سیر ایران کی روداد بھی جس کے چند دلچسپ اور معلوماتی اقتباسات درج ذیل ہیں:

"23 ستمبر 1885ء 12 ذی الحجہ سنہ 1302ھ یوم شنبہ چھ بجے شام کو لاہور سے آتش فشاں اژدہے (ریل) پر سوار ہو کر فرش خاک کو لپیٹا۔ دو دن اور رات میں کراچی جا اُترا۔ وہاں سے نہنگ دخانی (جہاز) پر بیٹھ کر سطح آب کو طے کیا اور دسویں دن بوشہر جا پہنچے۔ جہاز میں دورانِ سفر اور برہمی طبع کی طرف سے بڑا اندیشہ تھا کہ صفراوی مزاج ہوں مگر شکر خدا کہ معلوم بھی نہ ہوا۔ بڑا سبب اس کا یہ ہے کہ شوق سفر اور سواری

جہاز کے ذوق سے دل ایسا لبریز تھا کہ جب جہاز چند میل نکل گیا تب یاد آیا کہ خلل ہائے مذکورہ کا اثر مجھ پر ہے یا نہیں؟۔ اس وقت خیال کیا تو کچھ نہ تھا۔

بوشہر برائے نام ملک غیر ہے۔ کارداران ایرانی ہمارے ساتھ خوش سے بہت زیادہ رعایت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مجھے یہاں سب سے پہلے نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے تھے فارسی بولتے تھے جیسے ہزار داستان اور اس خوش ادائی سے بات کو ادا کرتے تھے کہ میں منہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ آٹھ دن کے انتظار کے بعد ایک راہوار پر بیٹھ کر کارواں میں روانہ ہوا۔ نودن تک کچھ پہاڑ کچھ میدان لپیٹ لپیٹ کر شیراز میں جا اترا۔

شیراز کو دیکھنے کا ارمان تھا۔ ایک عمر کے بعد خدا نے پورا کیا، اللہ اللہ خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن جس پر وہ لوگ تعریفوں اور دعاؤں کے پھول چڑھائیں اس کے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو۔ میں نے دیکھا اور تعجب سے دیکھا کیونکہ جس شیراز پر نورانی بزرگ نے نور برسائے تھے اُس کی رونق وآبادی اُن کے ساتھ ہی رحلت کر گئی۔ اب بڑی بڑی وسیع اور بلند پرانی مسجدیں اور کہنہ مدرسے گرے پڑے کھڑے ہیں اور بنانے والوں کی ہمتوں پر دلائل پیش کر رہے ہیں۔ ان میں نوجوان لڑکے صرف نحو، بلاغت، فقہ، اصول کی کتابیں سامنے رکھے بے مدد کتاب کے مسائل کتابی پر بحث کرتے ہیں۔ علما رکتب علمیہ کی تدریس سے پرانی ہڈیوں پر آبِ حیات چھڑکتے تھے....

جاڑے کا موسم کوہ برف لیے سر پر چلا آتا تھا۔ بڑھاپے نے خوف

کے لحاف میں دُبک کر کہا کہ شیراز تو دیکھ لیا اب اصفہان کو دیکھو اور آگے بڑھو کہ تلاش کی منزل ابھی دُور ہے۔

یہ راستہ آب رواں سے سبزا ور آبادیوں سے معمور تھا۔ جہاں منزل کرتا گاؤں میں جاکر پوچھتا اور جو اہلِ علم ہوتا اس سے ملاقات کرتا ... میرے پاس کھانا پکانے کا سامان نہ تھا۔ وہیں بیٹھ کر کسی گھر سے روٹی مول لیتا کہیں سے انڈے، کہیں سے گھی۔ اشکنہ یعنی انڈوں کا قلیہ بناتا اسی میں روٹی ڈبو کر کھاتا اور شکرِ الٰہی بجالاتا .... غرض بارہ دن کے بعد اصفہان جا اُترا۔ شہر سے پہلے تختِ فولاد کا میدان سامنے آیا۔ یہاں ہزاروں بزرگانِ دین اور سرگانِ دُنیا کے اجسام بے ارواح نے شہرِ خموشاں بسایا ہے ... یہ شہر سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے جگہ بہت رہنے کی ہے مگر جاڑے کے ڈر نے پانچ دن سے زیادہ نہ ٹھہرنے دیا مجھے یہ بھی خیال تھا کہ چلے چلو طہران میں چل کر ڈیرے ڈالیں گے۔"

اصفہان سے آٹھ منزل چل کر کاشان پہنچا مخمل بافوں کی صنعت اب تک اس کے نام کو چمکاتی ہے۔ فاضل ربانی ملا محسن کاشانی علیہ الرحمۃ کا مزار اب تک مرجع خاص وعام ہے۔ تین دن یہاں رہا چوتھے دن قُم پہنچا۔ یہاں سلطان دنیا و دیں ہشتمیں علی ابن موسیٰ رضا کی ہمشیرہ کا مزار مقدس ہے اور دن رات دربار شاہانہ لگا ہوا ہے۔ کئی عالم نامی د گرامی موجود ہیں۔ شیخ ابن بابویہ قمی علیہ الرحمۃ یہاں مدفون ہیں دن میں کئی دفعہ اُن کی قبر پہ جاکر بیٹھتا اور برکت حاصل کرتا تھا۔

اصفہان سے پندرہ منزلیں طے کر کے طہران میں داخل ہوا۔ لوگ اسے دارالخلافہ ایران کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں شاہ کی ہمت و برکت

سے آج علوم وفنون تہذیب ودولت اقبالی کا دار الخلافہ ہے۔شاہ جہاد نے جو سفر یورپ سے آکر ملک و مملکت میں روشنی پھیلائی ہے تو شہر کے باہر قصر عالیشان بنا کر شمس العمارۃ نام رکھا ہے اس کے پہلو میں مدرسہ دار الفنون بنا لیا ہے جسے یونیورسٹی کہنا چاہیے۔عمارت کی وضع بھی انگریزی طرز پر ہے۔اس میں فرنچ انگریز اور روس کے مدرس زبانیں اور فنون سکھاتے ہیں اور ایران کے نئے تعلیم یافتہ بھی مدرس ہو گئے ہیں

آخر جب سب سے اخیر برف پڑ چکی تو میں شوق کا زادِ راہ اور عقیدت کا کارواں باندھ کر مشہد مقدس کو روانہ ہوا۔چھ منزل طے کر کے شہر سمنان پہنچا۔ پانچویں دن دامغان کو اس سے بدتر حالت میں پایا۔شاہ رود بدترین بدتر۔ شاہ رود سے داہنے ہاتھ ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر شہر بسطام ہے جو کبھی حضرت بایزید بسطامیؒ کا وطن تھا۔نام کی محبت نے ادھر کھینچا۔سبزوار فقط بزرگوں کی زیارت گاہ باقی رہ گئی۔نیشاپور کا بڑا خیال تھا اس پر بڑا رونا آیا۔تمام خرابی اور کھنڈر پڑے تھے۔یہاں سے چوتھی منزل میں مشہد مقدس کی زیارت سے مشرف ہوا۔بارہ دن قیام کیا۔اکثر شاہوں اور شہزادوں کی قبریں دیکھی گئیں۔علماء میں شیخ بہاء الدین عاملی، شیخ حر عاملی، شیخ طبرسی رحمہم اللہ مدفون ہیں، ان بزرگوں کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھی۔

ہرات کے رستے میں ہمارا کارواں شتری تھا۔تیسری منزل میں نیند نے مجھ پر غفلت کا شبخون مارا، اونٹ سے گر پڑا۔ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ قدرتِ الٰہی نے جراحی کی، آپ ہی جڑ کر اچھی ہو گئی۔ راہِ مشہد اور ہرات میں، جام، مولانا جامی کا وطن آیا۔ایک ویران قصبہ رہ گیا ہے ... قندھار میں پہنچ کر پانچ دن ٹھہرنا پڑا، وہاں رہ کر دس کی جگہ بارہ روپے کرایہ

کے دیے اور کوئٹہ کو روانہ ہوا۔ خدا خدا کرکے پانچ دن کا راستہ گیارہ
دن میں طے کیا۔ کوئٹہ میں پہنچ کر شکرِ خدا بجالایا۔ دوسرے دن ایک چھکڑا
کرایہ پر کیا، اس میں کتابیں لادیں۔ آپ بچھونے بچھا اوپر بیٹھا۔ دو دن
ایک رات میں اندلی پہنچا۔ وہاں سے ریل میں بیٹھ کر د لاہور میں حاضرِ
خدمت ہوا۔"

1887 میں ملکہ وکٹوریہ کے پچاس سالہ جشنِ تاجپوشی کے موقع پر اُن کی ادبی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت نے انھیں شمس العلماء کا خطاب اور خلعت دیا۔

کچھ عرصے بعد حکومت نے گورنمنٹ کالج پنجاب یونیورسٹی کے حوالے کر دیا اور انھیں ملازمت سے سبکدوش کر دیا۔ اسی دوران انھوں نے درگاہ شاہ محمد غوث کے قریب ایک قطعہ آراضی لے کر وہاں کتب خانہ کی عمارت تعمیر کرائی۔ 1890ء میں ان کی طبیعت ناساز رہنے لگی جس کی وجہ سے کتب خانہ بھی اکثر بند رہنے لگا۔ اس پر لاہور میونسپل کمیٹی نے اُن سے تقاضا کیا کہ "یا تو کتب خانہ باقاعدگی سے کھولیں، اور اگر یہ ممکن نہیں تو معاوضہ لے کر عمارت بلدیہ کے سپرد کر دیں۔" چونکہ خرابیِ صحت کی بنا پر وہ کتب خانہ باقاعدگی سے چلانے سے معذور تھے اور کوئی دوسرا موزوں شخص نہ مل سکا۔ لہٰذا کتب خانے کی عمارت معاوضہ لے کر میونسپل کمیٹی کے حوالے کر دی۔ بعد ازاں جب ان کی وفات ہوگئی تو ان کے صاحبزادے آغا محمد ابراہیم نے تمام کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی کے حوالے کر دیا جو آج بھی "آزاد کولیکشن" کے نام سے وہاں موجود ہے، اور جس سے لاتعداد تشنگانِ علم و ادب مستفید ہو رہے ہیں۔

اگرچہ اپنی اکلوتی بیٹی کے سانحۂ ارتحال کے صدمۂ جانکاہ کو بھلانے کے لیے

مولانا سیر و سیاحت میں مصروف رہے لیکن وہ اپنی عزیز بیٹی کی یاد کو کبھی بھی بھلا نہ پائے نتیجہ یہ ہوا کہ طویل سفروں سے اُن کی صحت خراب ہوگئی اور بیٹی کے غم نے 1889 میں جنون کی صورت اختیار کرلی۔ شروع شروع میں تو جنون میں کچھ کمی رہی مگر بعد میں اُس نے شدت پکڑلی۔ اِس عالمِ دیوانگی میں کبھی تو وہ لاہور کے باغوں اور پارکوں میں گھومتے دکھائی دیتے اور کبھی صبح تیار ہوکر کالج کی طرف پڑھانے کی غرض سے چل پڑتے۔ اور کئی بار تو ایسا ہوا کہ لاہور سے باہر پٹیالہ اور دہلی تک پیدل چلے گئے۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ اسی عالمِ جنون میں انھوں نے "فلسفۂ الٰہیات" نامی کتاب بھی لکھی۔ 16 اکتوبر 1889 سے وہ طویل رخصت علالت پر رہے۔

مولانا کوئی بیس برس تک اسی حالتِ جنون میں رہے۔ 1909 میں اُن کی صحت مزید خراب ہوگئی اور ساتھ ہی خونی بواسیر نے بھی شدت اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ کھانا پینا بھی ترک کردیا۔ اور صرف چائے پر اکتفا کرنے لگے۔ اور آخر اسی دیوانگی اور بیماری نے انھیں وقتِ آخر تک پہنچا دیا۔ اور 22 جنوری 1910ء کی نصف شب کے قریب لاہور ہی میں ان کی وفات ہوگئی۔

اُن کی موت ایک سانحۂ عظیم تھا۔ آناً فاناً یہ اندوہناک خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق آکر اُن کی قیامگاہ پر جمع ہونے لگے۔ لیکن اُس دن صبح عاشورہ ہونے کی وجہ سے تدفین دوسرے دن پر ملتوی کردی گئی۔ اس بارے میں ان کے مداحوں، شاگردوں اور عزیزوں کو آگاہ کرنے کے لیے لاہور کے کوچہ و بازار میں جگہ جگہ اشتہار لگائے گئے۔ اور اخبارات میں بھی اُن کے انتقالِ پُرملال سے متعلق خبریں شائع کی گئیں۔ اگلے دن اُن کے ماتم میں تمام مدارس اور سرکاری دفاتر میں تعطیل

کر دی گئی تاکہ لوگ اُن کے جنازے میں شرکت کر سکیں۔

بڑی شان و احترام سے اُن کا جنازہ "گامے شاہ" لایا گیا اور بے شمار لوگوں کی موجودگی میں اِس عظیم المرتبت شخصیت کا جسدِ خاکی سپرد خاک کر دیا گیا - اور - اس کے بعد مدتوں تک اخبارات و جرائد میں اُن کی حیات و فن سے متعلق مضامین شائع کیے جاتے رہے اور تاریخ ہائے وفات اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔

عادات وخصائل

مولانا محمد حسین آزاد بڑے سادہ مزاج اور تصنع وتکلف سے پاک شخصیت تھے۔ وہ ہر ایک سے بڑے خلوص اور تپاک سے ملا کرتے تھے اور ہر ایک کے تئیں پیار اور محبت کا جذبہ رکھتے تھے۔ اپنے شاگردوں کا خصوصی طور پر دھیان رکھتے تھے اور اس سلسلے میں ان کے دل میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ تھی۔ ان کے شاگرد پنجاب کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے، جب بھی وہ کسی علمی وادبی تحقیق یا پرانے سکوں کی تلاش میں نکلتے تو ہر شاگرد سے ملنے کی کوشش کرتے اور اس کی امداد و اعانت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرتے۔

اُن کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے وسیع القلب واقع ہوئے تھے، اُن کے دل میں ہندو مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی اور وہ ہر ایک سے مساوی سلوک کرتے تھے۔

وہ مولویانہ اور قدیم وضع قطع کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ بڑے پائنچے کا لٹھے کا پاجامہ، مغلئی گریبان کا کرتہ اور لال رنگ کا سلیم شاہی جوتا۔ موسم سرما میں وہ پاجامے کو پنڈلیوں پر لپیٹ کر ساق بند باندھتے۔ شدید سردی کی حالت میں وہ کشمیرے کی آستین کا اضافہ کر لیتے۔ گھر میں روئی کا کوٹ نیم

آستین پر فرغل پہن لیتے۔ سر پر فاختی یا سفید رنگ کا کشمیری صافہ باندھتے۔ کشمیری کام کیا ہوا چغہ انھیں بے حد پسند تھا۔

گرمیوں میں وہ نین سکھ کا انگرکھا اور اُس پر سفید چغہ پہنتے۔ سر پر تیز ترچھی کی چوگوشیہ ٹوپی اور اُس پر بائیں جانب سے سفید رومال بھی باندھتے۔

گھر سے کالج گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے تھے۔ گھوڑے کے دونوں طرف متعدد شاگرد ہوتے تھے جو راستہ بھر اُن سے مختلف علمی و ادبی سوال کرتے اور مولانا ہر ایک کا سوال بڑے دھیان سے سنتے اور پھر اپنے جواب سے انھیں مطمئن کر دیتے۔

لکھنے کا کام وہ دن کو نہیں بلکہ نصف شب کو تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد شروع کرتے اور صبح تک خامہ فرسائی میں معروف رہتے۔ پھر جب بادِ سحر صبح کی آمد کی خبر دیتی تو نمازِ فجر ادا کر کے شہر کے چہار اطراف پھیلے سرسبز و شاداب باغات میں سیر کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔

تاریخ اور سیر و سیاحت میں اُن کی خصوصی دل چسپی تھی تاریخ کے باب میں انھوں نے دربارِ اکبری ایسی کتابیں ہی تحریر نہیں کیں بلکہ تاریخی کتب اور قدیم سکّوں کی تلاش و جستجو میں دوٗر دراز کے سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور جنون کی حد تک بڑھے ہوئے اس شوق کی تکمیل میں اپنی آمدنی کا کثیر حصّہ بھی صرف کیا۔

سیر و سیاحت میں اُن کی غیر معمولی دل چسپی تھی اور انھوں نے ملک کے طول و عرض کا ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک کے طویل اور دشوار گذار سفر بھی کیے تھے۔ اندرون ملک انھوں نے لاہور سے کلکتہ تک اور کشمیر سے مدراس تک کے طویل سفر کیے تھے۔ انھوں نے عروس البلاد بمبئی کے علاوہ مالوہ ایسے تاریخی

شہروں کی بھی سیر کی۔ وہ سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لیے وسطی ایشیا کے ممالک افغانستان اور روس بھی گئے اور ادبی و ثقافتی مطالعہ کے لیے ایران کے مختلف شہروں کی خاک چھانتے رہے۔ ان کے اسی سفر کی بدولت ہمیں 'سخندانِ فارس' ایسی کتاب ملی۔

انھیں زبان و ادب سے متعلق مسائل کی تحقیق و جستجو سے گہرا لگاؤ تھا اس کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ یوں لکھتے ہیں۔

"مجھے اس کا شوق نہیں جنون ہے۔ لڑکپن میں لفظوں کے ہیر پھیر، ادل بدل کر فارسی اور سنسکرت کے الفاظ ملایا کرتا تھا۔ اس زبان میں تھوڑی سی معلومات بھی پیدا کیں۔ بڑی کوشش سے ژند، پہلوی اور دری کی کتابیں جو مل سکیں بہم پہنچائیں۔ انہی کے لیے بمبئی پھر ایران تک سفر کیا۔ موبدوں اور دستوروں سے ملا۔ ایک برس وہاں رہا۔"

انھیں ملک کی مختلف زبانوں ہی سے نہیں ملک کے مختلف مذاہب اور فرقوں میں بھی بڑی دل چسپی تھی۔ وہ مذہبی رواداری کے قائل تھے اور ملک کے مختلف مذاہب اور فرقوں میں یک جہتی اور رواداری دیکھنا چاہتے تھے انھیں مذہبی تفرقات سے بڑی نفرت تھی وہ ہر ایک کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت بڑی ملنساری اور رواداری کا سلوک کرتے تھے، اور دوسروں کو بھی پیار و محبت کا رویہ اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ:

"میرے باکمال دوستو! میں نے خود دیکھا اور اکثر دیکھا کہ بے لیاقت شیطان جب حریف کی لیاقت اپنی طاقت سے باہر دیکھتے ہیں تو اپنا

جتا جتانے کو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتے ہیں کیونکہ اس میں صرف دشمنی ہی نہیں بڑھتی بلکہ کیسا ہی با لیاقت حریف ہو اس کی جمعیت ٹوٹ جاتی ہے اور ان شیطانوں کی جمعیت بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے نافہم بے خبر بہت ہیں کہ بات تو نہیں سمجھے مذہب کا نام آیا اور آپے سے باہر ہو گئے۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذاہب کا کیا کام؟

ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گذرگاہِ دنیا میں یکجا ہو گئے۔ رستہ کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے، اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے مل جل کر چلو گے۔ ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھاتے چلو گے، ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف اُٹھاؤ گے اور ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے جو مزے کی زندگی خدا نے دی ہے بدمزہ ہو جائے گی۔"

وہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے تو کاغذ اور قلم پاس رکھتے اور جب کوئی مواد اپنی پسند یا مطلب کا نظر آتا فوراً نوٹ کر لیتے اور یوں مختلف موضوعات پر کافی مواد جمع ہو جاتا۔ اس میں وہ ترمیم و اضافہ کرتے رہتے تھے اور جب ضرورت پڑتی اُس سے استفادہ کرتے۔

وہ اکثر ایک چھوٹی سی دری پر بیٹھ کر تصنیف و تالیف کا کام انجام دیتے یہ دری انہیں 1857 کے ہنگامے میں اُس سکھ سردار نے عنایت کی تھی جس نے اس زمانۂ شورش میں اُن کی امداد و اعانت کی تھی۔ یہ دری انہیں جان سے زیادہ عزیز تھی۔ موسم سرما میں وہ اس دری پر پتلا سا گدیلا اور سفید

چاندنی کا فرش بچھا دیتے۔ پیچھے وہ گاؤ تکیہ رکھتے، سامنے لیمپ اور پہلو میں کشمیری قلمدان ہوتا۔ پاس ہی طشتری میں مختلف رنگوں کی پنسلیں اور مختلف اقسام کے قلم ہوتے۔ طشتری میں کٹی ہوئی چھالیہ بھی پڑی پڑی رہتی اور جب خواہش ہوتی چند دانے مُنہ میں ڈال لیتے۔

▲▲

آزاد بحیثیت نثر نگار

محمد حسین آزاد اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے، وہ نثر نگار اور شاعر ہی نہیں تھے، نقاد اور مورخ بھی تھے۔ انھوں نے علمی اور درسی کتابوں کے ذریعے ہی اُردو کی گراں بہا خدمت انجام نہیں دی بلکہ جدید نظم نگاری کی تحریک میں بھی اہم رول ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں جدید رنگ کا بانی کہا جاتا ہے۔

یوں تو آزاد نے شاعری میں بھی اپنے جوہر دکھلائے ہیں۔ لیکن نثر کے میدان میں انھوں نے ایسا اچھوتا اسلوب اختیار کیا جس کی پیروی کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ انھوں نے اپنے اسلوب تحریر میں عربی اور فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور الفاظ استعمال کرنے سے گریز کیا اور ساتھ ہی غیر ضروری اور بے موقع صنائع بدائع کا بھی استعمال کرنے سے احتراز کیا، درحقیقت اُن کی عبارت میں انگریزی کی وضاحت، زبان کی سادگی اور بے تکلفی نیز فارسی کا حُسن اور دل کشی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایسی خوب صورت اور اچھوتی تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں جو اُن کی عبارت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

آزاد کی تحریروں کے مطالعہ سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ

ایک منفرد اسلوب تحریر کے مالک تھے۔ جدت اور دل کشی اُن کی تحریر کا وصف خاص تھی جس سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آثارِ جنوں سے پہلے کی لکھی ہوئی اُن کی کتابوں میں اُن کی پروازِ تخیل اور خیالی پیکروں کو دیکھ کر انھیں اس عالمِ خاکی کا نہیں بلکہ ایک خیالی دنیا کا بندہ ماننا پڑتا ہے "نیرنگِ خیال" ہو کہ "آبِ حیات" "دربارِ اکبری" ہو کہ "سخندانِ فارس" سبھی تصانیف میں بے شمار جملے اور عبارتیں اُن کے اس اندازِ تحریر کی غماز ہیں۔

آزاد کے طرزِ تحریر کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ ضمیر متکلم کی بجائے جا بجا اپنے تخلص کا استعمال کرتے ہیں۔ گو اُن سے پیشتر بھی کئی مصنفین نے یہ اسلوب اپنایا مگر آزاد نے ایک نیا ہی انداز عطا کیا، مثلاً :

"ایک زمانہ تھا کہ بندۂ آزاد کو سب یاد تھا کہ نہ وہ رہے نہ بیاض رہی۔" (دیوانِ ذوق)

"کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں مگر آزاد تم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں۔ وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں۔"

(سخندانِ فارس)

"جب اُن کے چراغِ خاندان سید خورشید علی نفیس شعاع توجہ دریغ فرمائیں تو غیروں سے کیا امید۔ انھوں نے آزاد خاکسار کو آبِ حیات کی رسید سے بھی شاداب نہ کیا۔" (آبِ حیات)

اس کے علاوہ آزاد نے استعارات کا استعمال جگہ جگہ یوں کیا ہے کہ دوسرے نثر نگاروں سے کم ہی ہو پایا ہوگا۔ 'دربارِ اکبری' میں تذکرہ بیرم خاں میں کیا خوب استعارہ استعمال کیا ہے :

"دیکھو مُلا صاحب نے ظرافت کا نشتر مارا تھا، وہاں سے سخاوت کا چشمہ

بہہ نکلا۔"

دراصل آزاد کی طبیعت میں شگفتگی، نازک خیالی، لطافت اور جدت طرازی قدرت کی عطا کردہ تھی اور فارسی زبان وادب کے شوقِ مطالعہ نے اس جوہر کو مزید جلا بخشی۔ اُن کی دلکش نثر میں ایسی دل پذیر اور برجستہ مثالیں ملتی ہیں کہ بے ساختہ داد نکلتی ہے۔ وہ تاریخی واقعات وحادثات کے بیان میں بھی اپنے تخیل کی رنگ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً عبدالرحیم خان خاناں کے بچپن کے پُرآشوب دور کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"وہ تین برس کی جان کیا کرتا ہوگا۔ سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ اُن کی گود میں دُبک جاتا ہوگا، ڈر کر رہ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بیچارہ ریاں کہاں چھپاتیں کہ آپ ہی چھپنے کی جگہ نہیں۔ الٰہی تیری پناہ۔ عجب وقت ہوگا۔ شامِ غریباں اسی کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گذری ہوگی۔ دن ہوا تو روزِ حشر۔"

آزاد کے طرزِ تحریر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں کو تشبیہہ واستعارہ کی برجستگی، بیان کی سلاست وروانی، الفاظ کی شیرینی ولطافت اور فقروں کی موسیقیت سے ایسی دل چسپ، رواں اور منفرد عبادت بنا دیتے ہیں جسے پڑھتے ہوئے ایک عجیب سا نشہ چھا جاتا ہے اور اُسے مکمل صورت میں پڑھے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ علاوہ بریں وہ زبان ومحاورہ اور الفاظ وبندش کا استعمال بڑے متوازن اور متناسب ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے جدت طراز نثر نگار تھے جن کی ندرت آفرینی اور شگفتہ بیانی درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ انھوں نے منفرد اسلوب تحریر کے ایجاد کے علاوہ مضامین اور موضوعات کی ترتیب تالیف میں بھی جدتیں پیدا کیں۔

انھوں نے اُردو ادب کو 'آبِ حیات'، اور سخندانِ فارس جیسی بے نظیر کتابیں عطا کیں۔ واقعات کے علاوہ اسلوب و زبان پر اُن کی غیر معمولی قدرت نے ان کتابوں کو اپنے ڈھنگ اور طرزِ بیان میں انوکھا بنا دیا ہے۔

اُن سے پہلے کسی اُردو نثر نویس کی کتاب میں 'نیرنگِ خیال'، ایسے رمزیہ و تمثیلی مضامین اور اُن کے اسالیب و نگارش کا تنوع نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے اس سلسلے میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اس کتاب میں مذہبی، علمی اور ادبی مسائل کی تحقیق و تلاش کے ساتھ ساتھ تنقید و تبصرہ کا انداز بھی ملتا ہے نیز ان مضامین سے اخلاقی سبق بھی ملتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے دربارِ اکبری ایسی کتاب کو داستان و افسانہ کی طرح دلچسپ بنا کر رکھ دیا اور ساتھ ہی اسے ادبی شان و شوکت بھی عطا کی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آزاد کی تحریریں خامیوں سے پاک صاف ہیں۔ اُن میں ایک عیب تو یہ ہے کہ بعض جگہ انھوں نے استعارہ و تشبیہ کے استعمال سے اصل واقعات میں خیالی رنگ بھر کر اُسے افسانوی رنگ دے دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے تنقید کے میدان میں بھی توازن قائم نہیں رکھا اور جانبداری اور مبالغہ آمیزی سے کام لے کر اُسے خیالی اور فرضی شے بنا کر رکھ دیا ہے جسے تحقیق و تنقید نہیں کچھ اور ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ ہستی کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آمیزی سے کام لے کر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور اپنے ناپسندیدہ شخص کے بارے میں لکھتے ہوئے جانبدارانہ اور منفی رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور اس میں ہر طرح کے کیڑے نکالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 'دربارِ اکبری' میں انھوں نے ملا عبدالقادر کی عیب جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اور آبِ حیات کے

پہلے اڈیشن میں اپنی ذاتی رنجش کی وجہ سے مومن خاں مومن ایسے مشہور و معتدد شاعر کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ لیکن اس کے برعکس اپنے استاد محمد ابراہیم ذوق دہلوی کی شاعری اور فن پر لگ بھگ ساٹھ صفحات وقف کر دیے اور ان کی تعریف و توصیف میں کوئی کسر اُٹھا کر نہ رکھی۔ جبکہ غالب ایسے عظیم و معروف شاعر کو اپنے اُستاد کے مقابلے میں کمتر شاعر ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اُن کے تئیں منفی رویہ اپنایا اور اُن کے لیے صرف تیس بتیس صفحات ہی وقف کیے۔

ان کوتاہیوں کے باوجود اُن کی ادبی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی۔ ان کا مرتبہ موجد کا بھی ہے اور صاحبِ طرز کا بھی۔ وہ نقاد و محقق بھی ہیں اور مورخ و تذکرہ نویس بھی۔ وہ ایک ایسی ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں جن کے دلچسپ اسلوب تحریر اور انفرادی ڈھنگ سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور جن کی تصانیف کے مطالعہ کے بغیر ہر صاحبِ علم و ادب کا مطالعہ و علم نامکمل اور ادھورا رہ جاتا ہے۔

▲▲

تصنیف و تالیف

۱۔ آبِ حیات

یوں تو آزادؔ نے بہت سی کتابیں تصنیف یا تالیف کیں لیکن اِن سب میں 'آبِ حیات' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کی اس شاہکار تصنیف کو اپنے موضوع اور اپنے اسلوبِ تحریر کی وجہ سے اُردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسے تاریخِ شعرائے اُردو تو نہیں کہا جا سکتا تاہم یہ بلاشبہ اُردو شعراء کا ایک اہم ترین تذکرہ ہے جسے اُس سے پیشتر لکھے گئے تمام تذکروں شعری مجموعوں اور بیاضوں پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے جو تذکرے لکھے گئے تھے وہ قابلِ اعتنا نہ تھے اور مکمل بھی نہیں تھے۔ ان میں بعض اہم شعراء کا ذکر صرف چند سطور تک محدود تھا اور وہ بھی تعریف و تحسین کی صورت میں۔ ان کی شعری خصوصیت اور اہمیت پر ناقدانہ رائے کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس سلسلے میں "آبِ حیات" ایک مکمل تذکرہ تھا جس میں اُردو کے لگ بھگ تمام اہم شاعروں کا ذکر اور اُن کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے تھے جس سے اُردو شاعری کے بتدریج ترقی و فروغ کے مراحل سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔

'آبِ حیات' ایک ایسی اہم کتاب ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اردو ادب کا مطالعہ تشنہ سا رہ جاتا ہے نیز یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کی اساس پر بہت

سی کتابیں لکھی گئیں لیکن کسی میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔

شعری معلومات کا یہ بیش بہا خزانہ اپنے اسلوب تحریر میں بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے جسے بعد کے بہت سے ادیبوں نے نقل کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی تحریر میں وہ دلچسپی روانی اور شعریت پیدا نہ کر سکے جو آزاد کی تحریر کا خاصہ ہے اس تحریر میں دریا کی موجوں کی سی روانی کے علاوہ ایسی شعریت پائی جاتی ہے جسے پڑھتے وقت قاری اتنا محظوظ اور لطف اندوز ہوتا ہے کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اتنی خوبیوں کے باوجود یہ شاہکار خامیوں سے خالی نہیں اسے لکھتے وقت آزاد نے نہ صرف یہ کہ غیر جانبداری سے کام نہیں لیا بلکہ بعض جگہ بہت زیادہ جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے مثلاً اپنے اُستاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے تذکرے میں وہ جوشِ عقیدت و احترام میں اُن کی تعریف و توصیف میں بڑی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف اور بہادر شاہ ظفر کا کلام ذوق کا لکھا ہوا ہے۔ وہ اپنے استاد کی کورانہ عقیدت کی وجہ سے اُن کے حالات و کوائف پر ساٹھ صفحات صرف کر دیتے ہیں اور مرزا غالب ایسے عالی مرتبت شاعر کو اپنے اُستاد کے مقابلے میں کمتر دکھانے کے لیے اُن کی شاعری میں عیوب و نقائص نکالنے کے ساتھ ساتھ در پردہ اُن پر چوٹیں بھی کرتے جاتے ہیں نیز ان کے حالات میں بھی اختصار سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح انیس و دبیر کے تذکرے میں بھی جانبداری کے زیرِ اثر وہ دبیر کے خاندان کو کمتر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیز انشار اللہ خاں انشا کی زندگی کے آخری دنوں سے متعلق بیان کی گئی کہانی بھی افسانہ معلوم ہوتی ہے جس میں صداقت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح مصحفی اور انشا کے معرکے میں

وہ بر ملا انتشار کے طرف دار بن جاتے ہیں۔ تاہم ان خامیوں کے باوجود یہ ایک ایسا شاہکار ہے جس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

2۔ **نیرنگِ خیال** اپنے منفرد جدید اسلوب میں لکھی گئی آزاد کی کتاب "نیرنگِ خیال" بھی نثری ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس کتاب میں خیالی اور تمثیلی مضامین ہیں جن میں خواب اور خیالی افسانوں کی تمثیل میں اخلاقی اور نصیحت آموز باتیں کہی گئی ہیں۔ ان کی تحریک و ترغیب انھیں ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائیڈ نے دی۔ اس کی تصنیف 1880 میں ہوئی تھی۔

اُردو میں اگرچہ اس قسم کی خیالی حکایات کا فقدان تھا تاہم قدیم رومی اور یونانی ادبیات کے علاوہ بعض یورپین زبانوں میں بھی اس طرح کی رمزیہ تصانیف پائی جاتی تھیں۔ انگریزی ادب میں سویفٹ، ایڈیسن، جان بنیں اور اسپنسر ایسے ادیبوں نے بھی اس طرح کی کتابیں اور متفرق مضامین لکھے تھے، فارسی میں مثنوی مولانا روم اور انوار سہیلی، عربی میں اخوان الصفا اور سنسکرت میں ہت اُپدیش بھی اسی اسلوب کی کتابیں ہیں لیکن آزاد نے غالباً اپنی اس تصنیف کی بنیاد یونانی ادبیات پر رکھی تھی اور اس سے ان کی یونانی علم الاصنام سے بھی واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

چونکہ انھوں نے یہ کتاب کرنل ہالرائڈ کی ترغیب دا ایما پر لکھی تھی، لہٰذا اس کا خاکہ بھی اُن کی مدد سے ہی تیار کیا گیا تھا اور انھوں نے اس سلسلے میں اشارات بھی فراہم کیے تھے لیکن آزاد نے اپنے اسلوبِ تحریر سے ان خیالی مضامین میں ایسے نکات پیدا کیے جو اخلاقیات کا غیر معمولی سرچشمہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحریر میں وہ روانی و شگفتگی ہے کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اگرچہ آزاد انگریزی زبان وادب سے زیادہ واقف نہ تھے لیکن انھوں نے اس تصنیف میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور انھیں اتنا دل چسپ بنا دیا ہے کہ کوئی بھی مضمون ادھورا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

چونکہ آزاد سرکاری ملازمت میں تھے اس لیے سیاسیات پر قلم فرسائی ان کے لیے خارج از بحث تھی۔ علاوہ بریں اس زمانے میں سیاسیات کے معاملے میں ہندستانی عوام اتنے بیدار بھی نہ تھے اور زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور سرکاری ملازمت پانے کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود آزاد نے رمز و تمثیل کے ذریعے مذہب و اخلاق اور علم و فن پر بصیرت افروز خیال آرائی کی اور عجیب و منفرد پیرائے میں بڑے لطیف نکتے بیان کیے ہیں۔

3۔ **سخندانِ فارس** مولانا کی تصانیف میں 'سخن دانِ فارس' کو بھی بڑی شہرت حاصل ہے۔ ادب فارسی سے متعلق یہ کتاب بڑے دل چسپ اور دل کش انداز میں تحریر کی گئی ہے اور اس میں ان کے سفرِ ایران کے حالات و تجربات بھی درج ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے اور پہلے حصے میں زبان فارسی کی اصلیت و ساخت کے بارے میں لکھا گیا ہے اور دوسرے حصے میں کالج کے طلبا کے لیے مرتب کیے گئے ایک درجن سے زائد لیکچر شامل ہیں۔ پہلا لیکچر ۹ فروری 1872 کو ہوا تھا اور یہ سلسلہ کئی برس بعد پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ اس حصے میں ایران کی قدیم زبان، مابعد اسلام کی زبان ایران کے تمدن و تہذیب اور رسم و رواج اور ان کا زبان پر اثر، ملکی انقلابات کا زبان و ادب پر اثر، شعرا و ادبا کی

حیات وتصانیف کا تذکرہ، ہندوستان میں فارسی زبان وادب سے متعلق دلچسپ اور کارآمد مضامین شامل ہیں۔

درحقیقت یہ لسانیات سے متعلق کتاب ہے اور اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فارسی اور سنسکرت دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔ گو اسے مکمل تصنیف نہیں کہا جا سکتا، تاہم یہ بہت ہی مفید اور معلوماتی کتاب ہے جس میں جا بجا مولانا کی رنگینیٔ تحریر کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اسی طرح ان کی تصنیف سیرِ ایران بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

4۔ دربارِ اکبری جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مغل فرماں روا جلال الدین محمد اکبر اور اس کے ارا کین دربار سے متعلق ایک تاریخی کتاب ہے جس میں شہنشاہ اکبر کے نجی اور درباری حالات نیز سلطنت کے اہم امیروں وزیروں اور عالموں کے سوانحی حالات مختلف تواریخ سے حاصل کیے گئے اور انھیں بڑے موثر اور دلپذیر انداز میں قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو لکھتے وقت یوں تو بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن ملا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" خصوصاً سب سے اہم ماخذ ہے۔

اِس تاریخی موضوع کی اس کتاب کا اسلوبِ تحریر بھی منفرد اور لاجواب ہے، اکبر اور اُس کے ارا کینِ سلطنت کے سوانحی حالات بڑی تفصیل سے اور دلچسپ انداز میں لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر اکبر کے عہدِ حکومت کی جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں۔ لیکن افسوس کتاب پر نظرِ ثانی نہیں کی گئی۔ اگر آزاد نے اس پر نظرِ ثانی کر لی ہوتی تو اس کے بعض نقائص دور ہو سکتے تھے اور اہمیت وافادیت میں

مزید اضافہ ہو جاتا۔

کلام ذوق کی تدوین

آزاد نے اپنے عزیز اُستاد حضرت ذوق دہلوی کی ترتیب و تدوین کا کارنامہ بھی انجام دیا تھا جسے اہلِ اُردو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ اگر یہ مرتب دیوان وجود میں نہ آتا تو ذوق کا نام صرف تذکروں تک ہی محدود رہتا اور ہم ان کے کلام کے مطالعہ سے محروم رہ جاتے۔ یہ آزاد کا ہم پر احسان ہے کہ انھوں نے لاتعداد تکالیف برداشت کیں مگر اسے ضائع ہونے سے بچا لیا۔ اس بات کو بھلا کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ 1857ء کے ہنگامے میں جب جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور لوگ اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے تو انھوں نے گھر کے بیش بہا سامان پر استاد کے کلام کے مسودے کو ترجیح دی۔ اور اسے بچا کر لے آئے۔ اگر وہ استاد کے تئیں یہ خدمت انجام نہ دیتے تو آج ملکُ الشعرا، خاقانیِ ہند قعرِ گمنامی میں پڑے ہوتے۔ دیوانِ ذوق میں ابتدائی کلمات یہ ہیں:

"ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں، صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے، دیوانِ مروّجہ میں کچھ چھپے اور اُن کی زبان سے بھی کبھی کچھ سُنے اور کبھی کچھ سُنے۔ پھٹے پُرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت سی تحریریں ہیں بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا تھا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اُجالنا اُس زمانے کے خیالات کو... سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شاملِ حال تھی۔ میں حاضر اور خدا

ناظر تھا۔ راتیں صبح ہوگئیں اور دِن اندھیرے ہوگئے جب یہ مہم
سرانجام ہوئی"۔

اِس مرتّبہ دیوان میں آزاد کے مختصر دیباچے کے علاوہ کئی غزلوں کے ساتھ ان کی تصنیف کا پس منظر اور حالات بھی بیان کیے گئے ہیں جس سے اس کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اس دیوان میں پہلے کے مطبوعہ کلام کے علاوہ کچھ اور غزلیں بھی شامل ہیں جن کے بارے میں کچھ ناقدین کو شک وشبہ ہے کہ یہ الحاقی کلام ذوق کا نہیں۔

مکتوبات آزاد اُن کے خطوط پر مشتمل یہ ایک اہم کتاب ہے جو ہمیں اُن کی زندگی کے حادثات وواقعات سے روشناس ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے، یہ خطوط مولانا نے اپنے ایک عزیز میجر ڈاکٹر سیّد حسن بلگرامی برادر عزیز نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی کے نام تحریر کیے ہیں جو انڈین میڈیکل سروس میں فوجی ڈاکٹر تھے۔

یہ مکتوبات سب سے پہلے ۱۹۰۶ میں لاہور کے مشہور اخبار 'مخزن' میں بالاقساط اشاعت پذیر ہوتے رہے پھر ۱۹۰۷ میں انھیں کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ کتاب کے آغاز میں نامور صحافی اور ادیب سید جالب دہلوی کا تحریر کردہ دیباچہ ہے جو اُن دِنوں لاہور کے مشہور روزنامے 'پیسہ اخبار' کی ادارت سے وابستہ تھے اور بعدازاں لکھنؤ سے روزنامہ "ہمدم" نکالتے رہے۔

اِن خطوط میں مولانا نے مختلف حالات ومعاملات قلمبند کیے ہیں جن میں بعض قطعی ذاتی ہیں اور کچھ عام مسائل کے بارے میں، مثلاً کسی میں اپنی ملازمت کالج اور یونیورسٹی کا ذکر چھیڑا ہے تو کسی میں کتابوں کی اشاعت

و طباعت کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔

چونکہ یہ خطوط مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب 'غبارِ خاطر' کے خطوط کی طرح اشاعت کے لیے نہیں لکھے گئے لہٰذا اس کتاب کے خطوط کی زبان سیدھی سادی ہے اور یہ بے تکلفانہ نجی تحریر کا ایک عمدہ نمونہ ہیں جس میں بہت کم مقامات پر اُن کے مخصوص ادبی اسلوب تحریر کی جھلک ملتی ہے۔ اکثر خطوط میں آداب والقاب، 'عالی جناب' اور 'جنابِ من' پر مشتمل ہیں۔ بعض میں اس دَور میں رائج بھاری بھرکم عربی دعائیہ کلمے بھی ہیں جیسے ادام اللہ اقبالکم یا وضاعف اجلالکم۔ آخر میں یا تو اپنا پورا نام مع تخلص درج کیا ہے یا صرف آزاد تخلص پر ہی اکتفا کیا ہے۔

یہ ایک بڑا اہم مجموعۂ خطوط ہے جو اگر شائع نہ ہوتا تو اُن کی زندگی کے کئی گوشے ہماری نظروں سے اوجھل رہ جاتے۔

فلسفۂ الٰہیات

اسی طرح فلسفۂ الٰہیات مولانا آزاد کی وہ معروف تصنیف ہے جو زیادہ تر انھوں نے عالمِ دیوانگی میں تحریر کی۔ اور یہ فخر بھی انہیں ہی حاصل ہے کہ انھوں نے جنون کی حالت میں بھی فلسفۂ الٰہیات 'سپاک و نپاک'، اور جانورستان کتابیں تصنیف کیں۔

آزاد اکثر و بیشتر دُنیائے تخیل میں کھوئے رہتے تھے، اور یہ بھی قدرت کی دین ہے کہ جب اُن پر دیوانگی کا عالم طاری ہونے والا تھا تو اس سے پہلے ہی اُن کے دل و دماغ میں تصوّف اور الٰہیات کا جذبۂ شوق موجزن ہو گیا کہ اس حالت میں بھی وہ بے کیف و فیض نہ رہیں۔ قاعدہ ہے کہ جنون سے پہلے جیسے خیالات دل و دماغ پر چھائے ہوتے ہیں وہ اس دور میں اس کے تحت الشعور سے برآمد ہوتے ہیں۔ آزاد کو ہندوؤں کے فلسفۂ الٰہیات سے

سے گہرا لگاؤ تھا۔ لہٰذا اُن کی اس عالم کی تصنیف ''سپاک وناک'' میں بھی اس کا اثر ہے اور فلسفۂ الٰہیات اوّل سے لے کر آخر تک اسی رنگ میں ہے۔

فلسفۂ الٰہیات میں عربی فارسی اور سنسکرت سے ماخوذ حکیمانہ خیالات و جذبات الہامی اُردو کے انداز میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس کی ابتدا ایک تمہید سے ہوتی ہے اور اس کے بعد کتاب کا آغاز جو سات ابواب پر مشتمل ہے جن کا نام ملاپ رکھا گیا ہے۔ ہر ملاپ یعنی باب کا ایک عنوان ہے۔ کہیں کہیں عنوان کے نیچے باب کے موضوع کی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے۔

پوری کتاب میں ہندو فلسفے ویدانت کی اصطلاحات فلسفۂ تصوّف کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالمِ جنون میں کوئی غیبی قوت یا روح اُن میں سرایت کر جاتی ہے اور وہی اس فلسفے کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتی ہے، جہاں کہیں خدا کا ذکر ہے وہاں وہ ایشور لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ حلول و تناسخ کے مسئلے کا مختلف مقامات پر ذکر چھیڑا گیا ہے اور کبھی اپنے آپ کو ایشور کا اوتار بھی تصوّر کرتے ہیں۔

''فلسفۂ الٰہیات'' کے علاوہ ''جانورستان'' اور ''سپاک وناک'' بھی اسی عہدِ جنون کی یادگار تخلیقات ہیں۔ اوّل الذکر میں کچھ جانوروں کے حالات و عادات اور اُن کی آوازوں اور بولیوں کے بارے میں لکھا گیا ہے، اور ''سپاک وناک'' صوفیانہ خیالات و نظریات کا ایک غیر مربوط مجموعہ ہے جس کے مطالعہ سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بڑے ذہین انسان تھے۔ جنون و دیوانگی کے باوجود اُن کی علمی قابلیت کا سکہ ماننا پڑتا ہے تاہم وہ بعض مقامات پر ایسے بہکے ہیں کہ قاری کو فوراً احساس ہو جاتا ہے

کہ مصنف صحیح الدماغ نہیں ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر کتاب فارسی شعرا کا مختصر تذکرہ نگارستانِ فارس، ہے جس میں رودکی سے لے کر آرزو تک تمام اہم فارسی شاعروں کا نمونۂ کلام اور سوانحی حالات درج ہیں۔ یہ تخلیق بہت سیدھی سادی زبان میں ہے مگر اس میں 'آبِ حیات'، کی سی روانی اور دلچسپی کا فقدان ہے۔

درسی کتابیں مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ آزاد نے پنجاب کے مدارس کے لیے اُردو، فارسی اور عربی کی درسی کتابیں بھی تیار کیں جو ابتدائی تعلیم سے لے کر ثانوی تعلیم تک پنجاب کے اسکولوں میں رائج رہیں۔ انھوں نے اُردو تعلیم کے لیے "اُردو کی پہلی کتاب سلسلۂ قدیم، اُردو کی دوسری کتاب سلسلۂ قدیم۔ اُردو کی پہلی کتاب، اُردو کی دوسری کتاب، اردو کی تیسری کتاب، اور اُردو کی چوتھی کتاب تیار کی اسی طرح فارسی نصاب کے لیے فارسی کی پہلی کتاب اور فارسی کی دوسری کتاب بھی ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے طلبا کے لیے 'جامع القواعد' اُردو قواعد، عربی قواعد، ترکی قواعد، قواعدِ فارسی برائے مڈل اسکول، آئینۂ صحت، نصیحت کا کرن پھول، آموزگار، قند فارسی، حکایاتِ آزاد، کائناتِ عرب، تذکرۂ علما، شہزاد، ابراہیم کی کہانی، قصص ہند، حصہ دوم ترجمہ عربک انٹرنس کورس (انگریزی) لغت آزاد، جغرافیہ پنجاب وغیرہ بھی طلبا کے لیے لکھیں، نیز ایک ڈرامہ بعنوان 'اکبر' بھی تحریر کیا۔

مولانا کی زیادہ تر کتابیں ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھیں اور بعض کی اشاعت ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ ان کے علاوہ بہت سی کتابیں ایسی تھیں جو یا تو نامکمل رہ گئیں یا جن کا صرف خاکہ تیار کیا جا سکا تھا۔ کچھ

کتابیں ایسی بھی تھیں جنھیں مکمل تو کر لیا تھا لیکن جن پر نظرثانی کا انھیں موقع نہ ملا تھا۔ نگارستانِ فارس، کائنات عرب اور تذکرۂ علمائے امامیہ اسی قبیل کی تصانیف ہیں جو اُن کی وفات کے بعد شائع تو ہو گئیں مگر جن پر نظرثانی نہ کی جا سکی تھی۔ جغرافیہ پنجاب کو انھوں نے صاف تو کر لیا تھا لیکن کسی وجہ سے اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ اسی طرح عربی گرامر نے تکمیل کے مراحل تو طے کر لیے مگر چھپنے سے رہ گئی۔ انھوں نے ابجدی ترتیب سے پنجاب کے اہم شہروں کے حالات بھی قلمبند کیے تھے۔ اِن شہروں کے علاوہ پنجاب کی راجدھانی لاہور کی بھی مفصل تاریخ لکھی تھی جس میں اس بات کا تذکرہ بھی ملتا ہے کہ وہ تاریخ دہلی مکمل کر چکے تھے لیکن اس تاریخ کا صرف تذکرہ ملتا ہے۔ مسودہ نایاب ہے۔ دیوانگی کے عالم میں بھی وہ لکھتے رہے اسی دور میں انھوں نے فلسفۂ الہیات پر کئی رسائل قلمبند کیے تھے جن میں سے اکثر شائع نہیں ہو پائے۔

آزاد نے تیس سال کے عرصے میں متعدد نثری کتابیں لکھیں جن کے مطالعہ سے اُن کے ادبی مقام کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی نثر میں ایسا اچھوتا اور دل چسپ اسلوب تحریر اپنایا جس میں جگہ جگہ ان کی انفرادیت اور کمالِ فن کی جھلک ملتی ہے۔ یہاں اُن کی اہم کتابوں میں سے چند شہ پاروں کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ نثر میں اُن کی عظمت و اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

آزاد کی نثری کتابوں سے چند اقتباسات

(۱)

نظم اُردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے۔ نفس ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالمِ وجود میں آئی تھی مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولی نے آکر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی اور اثر اس کا دفعتاً حرارتِ برقی کی طرح دل دل میں دوڑ گیا گھر گھر شاعری کا چرچا ہے، جس امیر اور جس شریف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے۔ ان بزرگوں کی باتیں تو اِن کے شعروں سے سن بھی سکتے ہو مگر حیران ہوں کہ صورت کیوں کر دکھا دوں۔ اوّل تو حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل، اس پر میں زبان کا اپاہج۔ اس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں جو ایسے لوگوں کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر کھینچ دکھاؤں کہ ادب کی آنکھ ان کی متانت پر نظر نہیں اُٹھا سکتی اور محبت کی آنکھ اُن کی پیاری حالت پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکتی۔ دیکھو جلسہ مشاعرہ کا، امرا و شرفا سے آراستہ ہے معقول معقول بڈھے اور جوان برابر، لمبے لمبے جامے، موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں۔ کوئی کٹاری باندھے ہے۔ کوئی سیف لگائے ہے بعض وہ کہن سال ہیں کہ جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے بعض ایسے

ہیں کہ عالم جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رخصت کیا تھا اب کیونکر رکھیں کہ وضعداری کا قانون ٹوٹتا ہے۔ اس پرجوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج کے نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے۔ ان شوخیوں سے انھیں کچھ اور مطلب نہیں ہے مگر یہ کہ اپنے اوپر آپ ہنسیں اور اوروں کو خوش کریں.....“

(پہلا دور 'تمہید'۔ 'آبِ حیات')

” دوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس فصل میں زبان کے حُسنِ قدرتی کے لیے موسمِ بہار ہے۔ یہ وقت ہے کہ مضامین کے پھُول گلشنِ فصاحت میں اپنے قدرتی جوبن دکھارہے ہیں۔ حُسنِ قدرتی کیا شے ہے ؟ ایک لطفِ خُداداد ہے جس میں بناؤ سنگھار کا نام بھی آجائے تو تکلف کا داغ سمجھ کر سات سات پانی سے دھوئیں۔ اُن کا گلزار نیچر کی گلکاری ہے۔ صنعت کی دستکاری یہاں آکر قلم لگائے تو ہاتھ کاٹے جائیں۔ اس میں تو کلام نہیں کہ یہ باکمال بھی ایک ہی شہد کی مکھّی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں۔ خیالی رنگوں کے طُوطے مَینا نہیں بناتے۔ ہاں طوطی و بلبل کی طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے ہیں۔ انھوں نے اپنے نغموں میں گٹکری اینچ پلیٹ تان کسی گوییّے سے لے کر نہیں ڈالی۔ تم دیکھنا بے تکلف بولی اور سیدھی سادی باتوں سے جو کچھ دل میں آئے گا ایسا بے ساختہ کہہ دیں گے کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے کہ جب تک سننے والے سنیں گے کلیجے پکڑ کر

رہ جائیں گے .....“

(دوسرا دور۔ تمہید۔ آبِ حیات)

”اس مشاعرے میں ان صاحبِ کمالوں کی آمد آمد ہے جن کے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے زبانِ اردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے مرصع کار، مینا نگار پیچھے آئے مگر اس فخر کا نولکھا ہار انھیں بزرگوں کے گلے میں رہا۔ جب یہ باکمال چمن کلام میں آئے تو اپنے بزرگوں کی چمن بندی کی سیر کی۔ فصاحت کے پھول کو دیکھا کہ قدرتی بہار میں حسن خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے چونکہ انھیں بھی ناموری کا تمغہ لینا تھا اس لیے بڑوں سے بڑھ کر قدم مارنے چاہے۔ یہ گرد و پیش کے میدانوں میں بہت دوڑے سب پھول کام میں آئے ہوئے تھے۔ جب سامنے کچھ نہ پایا تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا۔ تم دیکھنا وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے۔ آسمان سے تارے اُتاریں گے۔ قدر دانوں سے فقط داد نہ لیں گے۔ پرستش لے لیں، لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آبنہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا۔ اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے۔ سودا کا کلام باوجود

بلندیٔ مضمون اور چستیٔ بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔
اتنی بات کا افسوس ہے کہ اس ترقی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف رُخ کیا، کاش آگے قدم بڑھاتے تا کہ حُسن و عشق کے محدود صحن سے نکل جاتے اور اُن میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ ان کی وسعت کی انتہا ہے۔ نہ عجائب و لطائف کا شمار ہے ....."

(تیسرا دور۔ تمہید۔ آبِ حیات)

"قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہلِ مشاعرہ آن پہنچے۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں۔

اُن کا آنا غضب کا آنا ہے

ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طراری طبع بارِ متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ مُنہ تھک جائیں گے مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے، انھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے، کبھی طرّے سجائیں گے۔ کبھی انہیں کو پھولوں کی گیندیں بنا لائیں گے اور وہ گلبازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھا ملے گا۔ ایسے قدر دان ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول ان کا چمن زعفران کے مول بکے گا۔
اِس دَور میں میاں رنگینؔ سب سے نئے گلدستے بنا کر لائے اور اہلِ جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختہ میں سے ریختی نکالی۔ ہم ضرور کہتے کہ ہندوستان

کی عاشقانہ شاعری نے اپنے اصل پر رجوع کی، لیکن چونکہ پہلے کام کی بنیاد اصلیت پر تھی اور اس کی بنیاد فقط یاروں کے ہنسنے ہنسانے پر تھی۔اس لیے سوائے تمسخر کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اگر لکھنؤ کے قیصر باغ اور وہاں کے معاملات کی تخم ریزی دیوانِ رنگین اور دیوان سید انشا کو کہیں تو کچھ بدگمانی یا تہمت میں داخل نہیں اگرچہ اصل ایجاد میاں رنگین کا ہے مگر سید انشا نے ان سے کچھ زیادہ سگھڑاپا دکھایا ہے۔۔۔۔"

چوتھا دور۔ تمہید۔ 'آبِ حیات')

" دیکھنا وہ لالٹینیں جگمگانے لگیں، آٹھو اٹھو استقبال کرکے لاؤ۔ اس مشاعرے میں وہ بزرگ آتے ہیں جن کے دیدار ہماری آنکھوں کے سُرمہ ہوئے اس میں دو قسم کے اعمال نظر آئیں گے۔ ایک وہ کہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین آئین سمجھا۔ یہ اُن کے باغوں میں پھریں گے۔ پُرانی شاخیں اور زرد پتّے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ نئے ڈھنگ کے گلدستے بناکر گلدانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کی دُخان سے ایجاد کی ہوائیں اُڑائیں گے اور بُرجِ آتشبازی کی طرح اس سے رُتبہ عالی پائیں گے۔ انھوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لیے مگر یہ غضب کیا کہ گردو پیش جو وسعتِ بے انتہا پڑی تھی اس میں سے کسی جانب نہ گئے۔ بالاخانوں میں سے بالا بالا اُڑ گئے۔ چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارا ہو جائے گا۔ اور بعض ایسے اُڑیں گے کہ اُڑ ہی جائیں گے۔ وہ اپنے آئین کا نام خیال بندی اور نازک خیالی رکھیں گے۔ مگر حق یہ ہے کہ شاعری ان کی ساحری

اور خود اپنے وقت کے سامری ہوں گے کہ انھیں پرستش کرنے والے بھی ویسے ہی ہاتھ آئیں گے۔ ان بزرگوں کی نازک خیالی میں کچھ کلام نہیں لیکن اتنا ہے کہ اب تک مضمون کا پھول اپنے حُسنِ خداداد کے جوبن سے فصاحت کے چمن میں لہلہاتا تھا۔ یہ اس کی پنکھڑیاں لیں گے اور سان پر موقلم سے ایسی نقاشی کریں گے کہ بے عینک کے نہ دکھائی دے گی۔ اس خیال بندی میں یہ صاحبِ کمال اس قدرتی لطافت کی بھی پروا نہ کریں گے جسے تم حُسنِ خداداد سمجھتے ہو کیونکہ ان کی صنعت بے اُس کے اپنا رنگ نہیں دکھا سکتی۔

(پانچواں دور تمہید۔ آبِ حیات)

(2)

اگر زبان کو فقط اظہارِ مطالب کا وسیلہ ہی کہیں تو گویا وہ اوزار ہے کہ جو کام ایک گونگے بیچارے یا بچّہ نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں، وہی اس سے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعۂ فولادی تیار کر دے جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے اور چاہے تو ایک بات میں اُسے خاک میں ملا دے جس سے ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے ان سے حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ایک نادر مرصّع کار ہے کہ جس کی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نولکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر اس کی قوم کو مالا مال کرتے ہیں وہ ایک چالاک عیّار ہے جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے قفل کھولتا ہے اور بند کرتا ہے،

یا مصوّر ہے کہ نظر کے میدان میں مرقّع کھینچتا ہے، یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اُسے پھول، گل، طوطی و بلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے اس نادر دستکار کے پاس مانیؔ اور بہزادؔ کی طرح مو قلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر آتی ہیں لیکن اس کے پاس استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوشنما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال چہچہا کر دیتا ہے۔ پھر بے اس کے کہ بوند پانی اِس میں ڈالے ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے کہ کبھی نارنجی، کبھی گلناری، کبھی آتشی، کبھی پیا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ اس طرح بوقلموں اور رنگا رنگ اور پھر سرتا پا عالمِ نیرنگ جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل گویا اُن کے قلم گھس گئے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہو گئی ہیں جس سے تمھاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مرقع تیار کرنے کے قابل نہیں رہی اور تعلیم یافتہ قومیں اسے سُن کر کہتی ہیں کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔

میرے دوستو! یہ قول ان کا حقیقت میں بیجا نہیں ہے ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزت پاتی ہے تو وہ سبب سے پاتی ہے اول یہ کہ اس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں۔ دوم اس کی انشا پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونوں صفتیں ہیں مگر ناتمام ہیں اور اس کے سبب ظاہر ہیں۔

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مفلس ہے اس کا سبب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اس کی ولادت کو ہوئے۔ اس کا

نام اُردو خود کہتا ہے کہ میں علمی نہیں بازار کی زبان ہوں اُٹھنے بیٹھنے لین دین کی باتوں کے لیے کام میں آتی ہوں. سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف وتالیف کا رواج نہ تھا مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک بچہ شاہجہاں کے گھر میں پیدا ہوا اور انگریزی اقبال کے ساتھ اس کا ستارہ چمکا جب صاحب لوگ یہاں آئے تو انھوں نے ملکی زبان سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا مگر سوا چند دیوانوں کے اس میں نثر کی ایک کتاب تک نہ تھی۔ ان کی فرمایش سے کئی کتابیں کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں، تصنیف ہوئیں اور انہی کے ڈھب کی صرف ونحو بھی درست ہوئی 1835ء سے دفتر بھی اُردو ہونے شروع ہوئے 1836ء میں ایک اردو اخبار جاری ہوا۔ 1842ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں اور اُردو نے برائے نام زبان کا تمغہ اور سکہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ جس زبان کی تصنیفی عمر 70 ـ 72 برس کی ہو اس کی بساط کیا ؟ اور اس کے الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا ؟ پس اس وقت اس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔

(اردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات، نیرنگِ خیال حصہ اوّل)

(3)

تھوڑی دیر بعد آمد آمد کی آوازیں آئیں اور داخلہ کا طبل گونجا ساتھ ہی ایک سے شور اُٹھا کہ قیامت برپا ہوگئی۔ تباہی کے جھکڑ چلے۔ بربادی کی آندھیاں آئیں، سینکڑوں سرِ خزاں کے پتوں کی طرح اُڑتے نظر آئے، کچھ ایسا وحشت خیز منظر بندھا کہ غدرِ دہلی کے افسانے آنکھوں میں پھر گئے۔ ہر طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں، نالہ وشیون

کی فریادیں، کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی کہ مغرب کی طرف سے ایک
امن کے بادل کا ٹکڑا آیا اور ارمان کے چھینٹوں سے گردِ وحشت کا منہ کیلا۔
ذرا سکون ہوا تو اس غبارِ قیامت آثار میں سے ایک پیرِ مرد، خضر صورت،
عیسیٰ حکمت برآمد ہوئے۔ تیوری پر کئی بل تھے کہ رنج والم کی زیادتی
کی ترجمانی کر رہے تھے، تمام کپڑے خون کی بوندوں سے افشاں بن رہے تھے۔
ایک ہاتھ دل پر تھا دوسرے میں تہذیب الاخلاق کا بستہ تھام رکھا تھا۔
گلے میں ایک جھولی لٹک رہی تھی جس پر سنہری لفظوں میں قومی چندہ لکھا
ہوا تھا۔ وقار و متانت زیادہ بولنے نہ دیتے تھے مگر جس وقت نصیحت و
حکمت کے سکے اردو کی ٹکسال میں ڈھل کر نکلتے تو زبان اردو پیروں پر
لوٹتی اور درد بھرے الفاظ پتھر کو پانی کر دیتے تھے۔ قومی تعلیم و اخلاق
کے سدھارنے میں اس قدر غلطاں و پیچاں تھے کہ اکثر بے خبری کے عالم میں
خبر نہ ہوتی تھی، مگر دونوں طرف دو بزرگ سفید ریش اور بھی ساتھ تھے کہ
دیکھنے والوں کو ہمزاد کا دھوکہ پڑتا تھا۔ وہ لحظہ بہ لحظہ سنبھالتے تھے اور لیے
چلے آتے تھے۔ جب یہ کمرے میں داخل ہوئے تو ہر طرف سے سدا بہار پھولوں
کا مینہ برسا۔ فرشتہء رحمت نے نہایت تعظیم و تکریم سے سنہری کرسیوں
پر بٹھا دیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے بزرگوار تو مسلمانانِ ہند کے بیڑے کے ناخدا
سرسید علیہ الرحمۃ ہیں اور یہ سایہ کی طرح نواب محسن الملک اور وقار الملک
ساتھ ساتھ ہیں۔ اِن لوگوں کے ہاتھوں میں اگرچہ عام خیر خواہی کے گلاب پاش
تھے اور جگہ جگہ خوشبو کی جگہ اپنی جان تک چھڑکنے سے گریز نہ کرتے تھے مگر
ناقدر شناسوں کی صف میں کئی تیر انداز تھے کہ تعصب کے ترکش میں
سے کفر و الحاد کے تیر لیتے اور حسد کی کمان میں جوڑ کر مار ہی دیتے تھے جس

سے دامن ضرور چھد جاتے تھے۔

اِن کے پیچھے پیچھے ایک اور بزرگ صورت جوان سیرت خراماں خراماں آئے۔ ہمہ تن نیکی اور اخلاق کا فوٹو تھے، چہرہ شگفتہ تھا مگر دل پر کچھ ایسی چوٹ کھائی تھی کہ گھڑی گھڑی گلے میں سے رومال کھول کر آنسو پونچھ لیتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی ایک چھوٹی سی کتاب نکالی اور دونوں پر رکھ کر سرسید کے سامنے نذر گزرانی۔ سرسید نے اٹھا کر آنکھوں سے لگائی اور ہاتھ بلند کر کے چاہتے تھے کہ کچھ دُعا کریں جو بقائے دوام کی ہوا نے اُس کو اُڑا کر سارے جہان پر پھیلا دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مسدس تھی۔ اور یہ خود مولانا حالی مرحوم۔ فرشتہ رحمت نے ان کو سرسید کے پہلو میں مسند دار زریں کرسی پر بٹھا دیا۔

(بقائے دوام۔ نیرنگِ خیال حصہ دوم)

(4)

امیر تیمور نے ہندوستان کو زورِ شمشیر سے فتح کیا مگر وہ ایک بادل آیا تھا کہ گرجا، برسا اور دیکھتے دیکھتے کھُل گیا۔ بابر اُس کا پوتا چوتھی پشت میں ہوتا تھا۔ سوا سو برس کے بعد آیا،اس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی کہ اسی رستے ملک عدم کو روانہ ہوا۔ ہمایوں کے بیٹے نے قصرِ سلطنت کی بنیاد کھودی اور کچھ اینٹیں بھی رکھیں مگر شیر شاہ کے اقبال نے اسے دم نہ لینے دیا۔ اخیر عمر میں اس کی طرف پھر ہوائے اقبال کا جھونکا آیا تو عمر نے وفا نہ کی۔ یہاں تک کہ 963 ہجری میں یہ با اقبال بیٹا جانشین ہوا۔ تیرہ برس کے لڑکے کی کیا بساط ؟ مگر خدا کی قدرت دیکھو، اس نے سلطنت کی عمارت کو انتہائے بلندی تک پہنچایا اور بنیاد کو ایسا استوار کیا کہ جنبش نہ ہوئی۔ وہ لکھنا پڑھنا

نہ جانتا تھا پھر بھی اپنی نیک نامی کے کتابے ایسے قلم سے لکھ گیا ہے کہ دن رات کی آمد و رفت اور فلک کی گردشیں انھیں گھِس گھِس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھِستے ہیں اتنا ہی چمکتے آتے ہیں۔ اگر جانشین بھی اسی رستے پر چلتے تو وہ بھی ہندوستان کے رنگا رنگ فرقوں کو دریائے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے، بلکہ وہی آئین ملک کے لیے آئینہ ہوتے۔ اس کے حالات بلکہ بات بات کے نکتے اول سے آخر تک دیکھنے کے قابل ہیں۔

جن دِنوں 'ہمایوں' 'شیر شاہ' کے ہاتھ سے پریشان حال تھا۔ ایک دن ماں نے اس کی ضیافت کی۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی اور دیکھتے ہی اس کے حُسن وجمال کا شیدا ہوگیا، دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حمیدہ بانو بیگم اس کا نام ہے۔ ایک سید بزرگوار شیخ زندہ پیل احمد جام کی اولاد میں ہیں اور آپ کے بھائی 'مرزا ہندال' کے اُستاد ہیں۔ یہ اُن کے خاندان کی بیٹی ہے، ہمایوں نے چاہا کہ اُسے عقد میں لائے۔ ہندال نے کہا، مناسب نہیں، ایسا نہ ہو کہ میرے اُستاد کو ناگوار ہو، ہمایوں کا دل ایسا نہ تھا کہ کسی کے سمجھائے سمجھ جاتا۔ آخر محل میں داخل کر لیا۔

لیکن حضرت عشق نے شادی کی تھی اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھا تھا۔ ہمایوں کو دم بھر جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا۔ ابھی پنجاب میں ہے ابھی سندھ میں ہے۔ ابھی بیکانیر جیسلمیر کے ریگستان میں سرگرداں چلا جاتا ہے۔ پانی ڈھونڈتا ہے تو منزلوں تک میسّر نہیں۔ جودھپور کا رُخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے۔ ناچار پھر اُلٹے پاؤں پھر آتا ہے۔ یہ سب مصیبتیں ہیں مگر پیاری

بی بی دم کے ساتھ ہے، کئی لڑائی کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اٹھانی پڑیں مگر اسے تعویذ کی طرح گلے سے لگائے پھرا۔ جب وہ جودھپور کے سفر میں تھے تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج و راحت کا شریک تھا اس سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے، ایام ولادت بہت نزدیک تھے اس لیے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا۔ اور آپ آگے پرانی لڑائی کو تازہ کیا اسی عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک اقبال کا تارا طلوع ہوا۔ یہ ستارا ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی۔ مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا آفتاب ہو کر چمکے گا اور سارے ستارے اس کی روشنی میں دھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے۔

ترکوں میں رسم ہے کہ جب کوئی ایسی خوشخبری لاتا ہے تو اسے کچھ دیتے ہیں۔ ایک سفید پوش اشراف ہوگا تو اپنا چغہ ہی اتار کر دے دے گا۔ امیر ہے تو اپنی دستگاہ کی بموجب خلعت اور گھوڑا اور نقد و جنس جو جو کچھ ہو سکے گا دے گا۔ سب کی ضیافتیں کرے گا۔ نوکروں کو انعام و اکرام سے خوش کرے گا۔ ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اسکی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا، کچھ نہ پایا۔ آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مشک نافہ ہے اسے نکال کر توڑا اور ذرا ذرا سا مشک سب کو دیا کہ شگون خالی نہ جائے۔ اللہ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا کہ دل میلا نہ کیجیو۔ اس بچے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔ (جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان۔ دربار اکبری)

(5)

964 ہجری میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیمو کی مہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے۔ جو نغمۂ بلبل کے سُر ول میں کسی نے آواز دی کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو فتح کی خوشی

میں یہ خوش خبری نیک شگون معلوم ہوئی اس لیے بادشاہ نے جشن کیا۔ وزیر نے خزانے لُٹائے اور اپنے بیگانوں کو انعام واکرام سے مالامال کر دیا۔ بیرم خاں کو تو عالم جانتا ہے۔ ماں کا خاندان بھی معلوم کر لو کہ جمال خاں میواتی کی بیٹی حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی۔ بڑی بہن بادشاہ کے محل میں تھی۔ چھوٹی وزیر کے حرم سرا میں، خالو بادشاہ نے خود عبدالرحیم نام رکھا۔ مبارک مولود کی ولادت خاص اسی شہر لاہور میں ہوئی۔

یہ پھول قریب تین سال کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال کے شبنم سے شاداب تھا۔ دفعتاً خزاں کی نحوست ایسی بگولہ بن کر لپٹی کہ اس کے گلبن کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور گھاس پھونس کی طرح مدت تک رواں دواں کرتی رہی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگے گا یا نہیں ہم کاغذوں کو دیکھنے والے ترس کھاتے ہیں۔ وائے بر حال اس کے رشتہ داروں اور ہوا خواہ نمک خواروں کے، جب اس کی اور اپنی حالت یاد کرتے ہوں گے تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہوں گے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا مگر حق یہ ہے کہ ایسے ہی اونچے سے گرتے ہیں جب اس قدر اونچے پر پہنچتے ہیں کہ دیکھنے والے تعجب کر کے کہتے ہیں' یہ تارا کہاں سے نکل آیا ؟ '۔

خدا تر نوالہ دے، خواہ سوکھا ٹکڑا۔ باپ کا ہاتھ بچوں کے رزق کا چمچہ، بلکہ ان کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ جب بیرم خاں کے اقبال نے منہ پھیرا اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آن کر دہلی میں آن بیٹھا۔ بیرم خاں آگرہ میں رہ گئے۔ یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ حال یہ تھا کہ رفیق ساتھ چھوڑ چھوڑ کر دہلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں تو اُلٹے جواب آتے تھے۔ عرض معروض کے لیے وکیل پہنچتا ہے تو قید، دربار کے طور بے طور خبر آتی

ہے تو وحشتناک۔ بچہ معصوم اِن رازوں کو نہ سمجھا ہوگا مگر اتنا تو دیکھتا ہوگا کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں وہ امرا اور درباریوں کی بھیڑ بھاڑ کیا ہو گئی۔ باپ کس فکر میں ہے کہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں....

969 ہجری میں یہ واجب الرحم بچہ دربار اکبری میں پہنچا تھا۔ اس کے باپ کے جانی دشمن اب ارکانِ دولت تھے۔ وہ یا اُن کے خوشامدی ہر وقت حضور میں حاضر رہتے تھے۔ اکثر ایسے تذکرے کرتے تھے جن سے بیرم کی پچھلی باتیں اکبر کو یاد آجائیں اور وہ اس کی طرف سے کھٹک جائے اکثر ان میں سے کھلم کھلا سمجھاتے لیکن اکبر کی نیک نیتی اور اس لڑکے کا اقبال تھا کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ غیروں کے دل میں اِن باتوں سے رحم پیدا ہوتا تھا۔ اکبر اُسے مرزا خان کہا کرتا تھا۔

ہونہار لڑکا اکبری سائے میں پرورش پانے لگا اور بڑا ہو کر ایسا نکلا کہ مورخ اس کی لیاقت علمی کی گواہی دیتے تھے بلکہ علمیت سے زیادہ تیزیٔ فکر اور قوتِ حافظہ کی تعریف لکھتے ہیں۔ علوم و فنون کی کیفیت اور اثنائے تحصیل اور حدِ تحصیل کی شرح کسی نے نہیں کھولی۔ قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابتدائے عمر کو اور امیرزادوں کی طرح کھیل کود میں برباد نہیں کیا کیونکہ جب وہ بڑا ہوا تو علمار کا قدردان تھا۔ اہلِ تصنیف اور شعراء کو عزیز رکھتا تھا۔ خود بھی شاعر تھا زبانِ عربی سے واقف تھا اور بے تکلف بولتا تھا زبان ترکی اور فارسی جو اس کے باپ دادا کی میراث تھی، اُسے جانے نہ دیا۔ حاضر جواب، لطیفہ گو، بذلہ سنج، بلبل ہزار داستان تھا۔ سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی۔ فن جنگ میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتا تھا....

اس کے باپ کے چند وفادار جاں نثار تھے جو محبت کی زنجیروں سے

جکڑے ہوئے تھے اور اپنی قسمتوں کو اس ہونہار باکمال کے ہاتھوں بیچے بیٹھے تھے۔ اس امید پر کہ اس کے ہاں مینہہ برسے گا تو ہمارے گھر میں بھی پرنالے گریں گے۔ حرم سرا میں کچھ شریف زادیاں اور پرستاریں تھیں جو کے ساتھ بے کسی اور بے بسی کی چادروں میں لپٹی بیٹھی تھیں، حسرت وارمان امید وناامیدی اُن کے خیالوں میں ایک طلسمات بنائی تھی ایک بگاڑتی تھی۔ بادشاہی دربار خدائی عجائب خانہ تھا۔ امیر اور سردار کہ وہاں سے پتلیاں بن کر نکلتے تھے۔ اس کے رفیق دیکھتے تھے اور رہ جاتے تھے دل میں کہتے تھے کہ ایک دن اس کا باپ جس کو چاہتا تھا اُسے جواہرات اور موتیوں میں چھپا دیتا تھا۔ کاش بیٹا ویسے انعاموں میں ہی شامل ہوجائے اس میں سب قدرت ہے وہ چاہے تو پھر وہی تماشہ دکھائے۔ دن رات، صبح و شام آدھی رات آسمان کی طرف ہاتھ تھے اور خدا کی طرف دھیان تھے دل آمین آمین کہہ رہے تھے۔

مرزا خان نہایت حسین تھا۔ باہر نکلتا تھا تو راستے کے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ناواقف خواہ مخواہ پوچھتے تھے کہ یہ کون خان زادہ ہے۔ مصوّر اس کی تصویریں اُتارتے تھے۔ امیر اپنے مکانوں اور دیوان خانوں کو سجاتے تھے۔ بادشاہ بھی اپنے دربار اور مجلس کا سنگھار سمجھتے تھے۔ بیرم خاں کے خوان کرم کے سینکڑوں نہ تھے ہزاروں کھانے والے تھے۔ کوئی وفا کا بندہ، کوئی زمانے کا مارا، کوئی عالم، کوئی شاعر، کوئی اہلِ کمال جو اُسے دیکھتا اور نام سنتا، آتا اور دعائیں دیتا، بیٹھتا اور اس کا مختصر دیوان خانہ متوسط حالت دیکھ کر باپ کے جاہ وجلال اور نیکیاں یاد کرتا اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ ان لوگوں کی ایک ایک بات اس کے اور اس کے رفیقوں کے لیے مرثیوں کا کام کرتی تھی اور خون کو آنسو کر کے بہاتی تھی۔" (مرزا عبدالرحیم خانِ خاناں۔ دربارِ اکبری)

آزاد بحیثیت شاعر

آزاد کا اُردو نثر نگاری ہی میں نہیں شاعری میں بھی ایک اہم مقام ہے۔ وہ اُردو کے ایک فطری شاعر تھے جنھوں نے اُردو شاعری کو صرف شعری تخلیقات سے ہی مالامال نہیں کیا بلکہ اسے ایک نیا موڑ بھی عطا کیا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں آزاد کو اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری میں دلچسپی تھی اور وہ اپنے والد کے عزیز دوست اور اس عہد کے مشہور شاعر حضرت ذوقؔ دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر چکے تھے۔ وہ روزانہ شام کو اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور رات گئے تک ان کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے۔ وہ ان کی معیت میں دہلی کے بڑے بڑے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اُن صحبتوں کا یہ اثر ہوا کہ انھیں اس عہد کے بڑے بڑے شعرا کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے کے علاوہ ان کے کلام کے حُسن و قبح سے بھی اچھی طرح آگاہی ہوگئی۔ اور اُن کے دل میں فطری طور پر جذبۂ شاعری موجزن ہوگیا۔ لیکن ابھی انھوں نے شعر و سخن کے میدان میں قدم رکھا ہی تھا کہ 1857 کے خونیں واقعہ نے دہلی کی بساط درہم برہم کردی اور وہ عرصہ تک ملک کے مختلف حصّوں میں بھٹکتے رہے اور اس ہنگامۂ شور و شر میں ان کا سارا ابتدائی کلام تلف ہوگیا۔

1857 کے ہنگامے کے بعد جب ذرا امن ہوئی تو اُن کی رگِ شاعری پھر پھڑک اُٹھی اور جیند کے قیام کے دوران انھوں نے سلام، قصیدے مرثیے اور رُباعیاں وغیرہ کہنی شروع کیں۔ ان دنوں وہ قدیم رنگ میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ لیکن درحقیقت ان کی شاعری 1874ء سے شروع ہوئی جب وہ محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔ اور کرنل ہالرائیڈ کی تائید و تعاون سے انھوں نے بزمِ ادب انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی تھی جس میں قومی اور اخلاقی موضوعات پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ آزاد کی مثنوی ابرِ کرم اور زمستان اسی عہد کی یادگار ہیں۔ اس جدت و ایجاد کا سہرا ان ہی کے سر تھا کہ انھوں نے سب سے پہلے اس جانب رجوع کیا تھا۔ اور خود نظمیں کہنے کے علاوہ دوسرے شعرا کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔

انجمن کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ اُردو شاعری کو مبالغہ آمیزی اور بے ضرورت فرسودہ تشبیہات و استعارات کے استعمال سے پاک کیا جائے، نیز یہ کہ مشاعرے میں مصرع طرح دینے کے بجائے خاص خاص موضوعات و عنوانات پر طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ انجمن کا پہلا اجلاس 8 مئی 1874ء کو اُن کی قیام گاہ پر منعقد ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے اپنی مثنوی "شبِ قدر" پڑھی تھی۔

مشاعرے کا یہ سلسلہ اگرچہ گیارہ مہینے تک چلتا رہا اور اس کی اکثر شاعروں نے بڑے زور و شور سے مخالفت کی تھی تاہم اس نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔

مشاعرہ بند ہو جانے پر بھی آزاد اپنی روش سے نہیں ہٹے۔ اور نہ کچھ نہ کچھ اس رنگ میں کہتے ہی رہے۔ انھوں نے کئی نظمیں انگریزی

نظموں کے طرز میں بھی لکھیں تاہم ان نظموں کو ترجمے کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں صرف خیالات ہی ماخوذ کیے جاتے تھے۔ جیسے ان کی نظم 'اولوالعزمی کے لیے کوئی سدِّ راہ نہیں'، ٹینی سن کی نظم ایکسلشیئر کے انداز میں ہے مگر اُسے صریحاً ترجمہ نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال انھوں نے انگریزی نظموں سے خیالات اخذ کر کے متعدد نظمیں لکھیں مثلاً 'محنت کرو'، 'ایک تارے کا عاشق'، 'شرافت حقیقی'، 'معرفت الٰہی'، 'جسے چاہو سمجھ لو'، 'جغرافیہ طبعی کی پہلی مبارکباد' اور 'جشن جوبلی' وغیرہ۔ ان کی مثنویاں 'شبِ قدر'، 'ابرِ کرم'، 'صبح امید' اور 'خواب امن' بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اول الذکر مثنوی میں انھوں نے مختلف پیشہ و فکر کے لوگوں کی رات کی سرگرمیوں اور اشغال کو بڑے خوب صورت اور دل چسپ پیرائے میں بیان کیا ہے، شاعر مہاجن، طالب علم اور چور حتّٰی کہ خود اپنی کیفیت بھی بڑے عمدہ انداز میں نظم کی ہے۔ 'ابرِ کرم'، مولانا الطاف حسین حالی کی 'برکھا رُت' کے انداز میں ہے اور اس میں موسم برسات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ 'صبح امید' میں بڑے موثر اور دلپذیر ڈھنگ سے یہ بتایا گیا ہے کہ کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ تجارت، زراعت، تعلیم، ملک گیری غرضیکہ ہر مرحلے میں امید ہی کام آتی ہے۔ مثنوی 'خواب امن' میں امن و امان کے ماحول کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور یہ نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے کہ ہر طرح کی ثقافتی ترقی اور فروغ صرف امن کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

آزاد کے شعری مجموعے "خمکدۂ آزاد" اور مجموعۂ نظم کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو شاعری میں اُن کا کیا مقام ہے۔ انھوں نے مولانا حالی کے ساتھ مل کر شعراء کو قدیم رنگ سے ہٹ کر جدید

طرز کی نظمیں کہنے پر راغب کیا۔ اس سلسلے میں وہ اردو شاعری میں پیشرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسا سنگ میل ہیں جہاں سے جدید شاعری کے آغاز کا پتا چلتا ہے۔ اس سے پہلے قدیم طرز کی روایتی عشق و محبت اور گل و بلبل کی شاعری ہوتی تھی جو مبالغہ آمیزی اور تکلف و تصنع سے بھرپور تھی لیکن آزاد اور حالی نے ہزار مخالفت کا سامنا کر کے اس نئے طرز و اسلوب کو مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ لہٰذا انھیں جدید شاعری کا بانی کہنا غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے اردو شاعری میں نئی روح پھونکی اور اسے نئے اسلوب و انداز سے روشناس کیا۔ وہ نیچر کی پیروی کرتے ہیں اور مبالغہ سے احتراز کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں صنائع بدائع سے پاک اور بہت سیدھی سادی زبان میں اپنے مطالب بیان کیے ہیں۔

▲▲

منتخب کلام

حُبِّ وطن

اے آفتابِ حُبِ وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہان ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا
اور انتظامِ دل زبر و زیر ہو رہا
تجھ بن سب اہلِ درد ہیں دل مُردہ ہو رہے
اور دل کے شوق سینے میں افسردہ ہو رہے
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہو گئے
کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو گئے
حبِ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں
کچھ ہو گیا زمانے کا اُلٹا چلن یہاں
حُبِ الوطن کے بدلے ہے بُغضِ الوطن یہاں
بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب اِدھر بھی کرم کی نگاہ ہو
عالم سے تاکہ تیرہ دلی دُور ہو تمام
اور ہند تیرے نور سے معمور ہو مدام
اُلفت سے گرم سب کے دلِ سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور
سب اپنے حاکموں کے لیے جاں نثار ہوں
اور گردنِ حریف پہ خنجر کی دھار ہوں
علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

لبریز جوشِ حبِ وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں

محنت کرو

ہے امتحاں سر پر کھڑا محنت کرو، محنت کرو
بانہ ہو گر بیٹھے ہو کیا، محنت کرو، محنت کرو

بے شک پڑھائی ہے سوا اور وقت تھوڑا ہے رہا
ہے ایسی مشکل بات کیا، محنت کرو محنت کرو

شکوے شکایت جو کرتے تم نے کہے ہم نے سُنے
جو کچھ ہوا اچھا ہوا، محنت کرو محنت کرو

محنت کرو انعام لو انعام پرا کرام لو
جو چاہو گے مل جائے گا محنت کرو محنت کرو

جو بیٹھ جائیں ہار کر کہدو انھیں للکار کر
ہمت کا کوڑا مار کر، محنت کرو محنت کرو

تدبیریں ساری کر چکے باتوں کے دریا بہہ چکے
بک بک سے اب کیا فائدہ، محنت کرو محنت کرو

یہ بیج اگر ڈالو گے تم دل سے اُسے پالو گے تم
دیکھو گے پھر اس کا مزا محنت کرو محنت کرو

محنت جو کی جی توڑ کر ہر شوق سے منہ موڑ کر!
کر دو گے دم میں فیصلہ محنت کرو محنت کرو

کھیتی ہو یا سوداگری ہو بھیک ہو یا چاکری
سب کا سبق یکساں سُنا محنت کرو محنت کرو

جس دن بڑے تم ہو گئے دنیا کے دھندوں میں پھنسے
پڑھنے کی پھر فرصت کجا، محنت کرو محنت کرو
بچپن رہا کس کا سدا انجام کو سوچو ذرا
یہ تو کہو کھاؤ گے کیا محنت کرو محنت کرو

اولوالعزمی کے لیے کوئی سدِ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے میری جاں چلے چلو
ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں ادھر ادھر ہیں امیدوں کی موجزن اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن
کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو
آؤ کہ کھولے اپنے نشاں ننگ و نام نے باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شاد کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سرو سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو
یارو چلو چلو، نہ کرو انتظار تم کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدانِ عزم و جزم کے ہو شہسوار تم بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر مار مار تم
ریلا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو
ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائیں گے دشمن فلک بھی ہوں گے تو سر کو جھکائیں گے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو!

آئینہ دل کا گردِ سفر سے اُجال دو پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ٹال دو
اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم اور ہو کبھی صلے کے نہ اُمیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم دو رُخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے آبِ رواں ہیں چشموں سے بہہ کر نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے جو تم رہے وہاں وہی خر در دلدل رہے
تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو

آگے بڑھو کہ اب نہیں تاب و قرار ہے کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لے لیا میداں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے چمکا یا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم ہیں معرکے اب خاتموں پہ آ گئے ہیں ان کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتہ نہیں جو نہ مٹ سکے وہ گونجا طبلِ فتح کہ میدان لے لیے
ہے کرنا لئے جنگ کی الحاں چلے چلو

●

مثنوی شبِ قدر

طالبِ علم

ہیں مدرسہ کے طالبِ علم اپنے حال میں ۔۔۔ کل صبح امتحان ہے سو اس کے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دَور سے ۔۔۔ پڑھتے جُدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کر لیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے ۔۔۔ کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے
جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دُور ہے
قسمت تو ہر طرح سے پہ محنت ضرور ہے

مہاجن

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہاں میں ۔۔۔ آدھی بجی ہے پر وہ ابھی ہے دُکان میں
گنتی میں دام دام کے ہے دم دیے ہوئے ۔۔۔ بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتا لیے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزاں تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھدام کی

چور

اے رات تیرے پردہ دامن کی اوٹ میں ۔۔۔ دُزدِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے ۔۔۔ اور ہاتھ ڈالا اسکے ہر اک لین دین میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر ۔۔۔ ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون لُوٹ لے گا

شاعر

اس تیرہ شب میں شاعرِ روشن دماغ ہے — بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے — اُڑتا پھرے ہے کھوئے ہوئے پرِ خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر — جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرّہ ذرّہ پہ افسوں نئے نئے — ہو جاتے ہیں وہی دُرِ مضموں نئے نئے
مضمون تازہ گر کوئی اس آن مل گیا
یوں خوش ہے جیسے نقشِ سلیمان مل گیا
اس تیرہ شب کے پردے میں شاعر جو چور ہے — پھرتا ٹٹولتا ہوا مانندِ کور ہے
مطلب اُڑاتا شعر سے مضموں غزل کے ہے — لاتا پر ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے
تعریفیں اس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

اپنے متعلق

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں — آزاد سر جھکائے خدا کے جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے — اور کرتا صدقِ دل سے دُعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض — رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض
یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زبان پر دل میں اثر کرے
آ جاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں — کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں
کر جاتا صاف دشمنِ بد بیں پہ چوٹ ہے — اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

دال

لے لے کے مزے کھائیں نہ ہم کیونکہ بھلا دال
ہے گوشت سے آزادوں کو سو درجہ سوا دال
ازبس ہے زمانے میں سدا دل کو بدل راہ
یہ دل پہ قربان ہے اور اس پہ فدا دال
ہوتی نہیں یہ گریۂ خوانِ کس وناکس
بے گوشت ہی خوش رہتے ہیں اور لیتے ہیں کھا دال
ہیں نعمتِ الواں سے سمجھتے اسے بہتر
آرام سے گھر بیٹھے اگر دیوے خدا دال
بل بے تری آداب کہ عالم میں ہمیشہ!
ہے تاجِ سرِ بیضۂ عنقا و ہما دال
بچپن کی جو ہے چاٹ تو پیری کا سہارا
ہے دال کی خوبی یہ دلا اس کی وفا دال
ہے دال کی گر چاولوں پر شفقتِ مادر
تو روٹیوں کو پالتی ہے مثل دوا دال
غربت میں بھی کرتی نہیں منعم سے کنارہ
جو حقِ رفاقت ہے سو کرتی ہے ادا دال
خوانِ امرا کا ہے اگر گوشت مصاحب
ہے کاسۂ غربت میں انیس الغربا، دال

از بس سگِ دُنیا ہیں بہت گوشت پہ گرتے
ہے اس لیے مرغوب نہیں ان کو سوا دال
نقصاں کے سوا ہوگا نہ کچھ گوشت سے حاصل
غافل ہے یہی خوب کہ کھا اور کھلا دال
ہے گوشت میں تاثیر فقط حرص و ہوا کی
اور اس کو جو دیکھو ہے فرشتوں کی غذا دال
قربانِ شکم تجھ کو جو ہونا ہے تو کھا گوشت
اور رفع ضرورت جو ہو مطلوب تو کھا دال
ہے نام میں بھی گوشت کے آثارِ ثقالت
اور اس کا لقب دیکھو کہ ہے دال شفا دال
یہ دال شفا مقتبس خاکِ شفا ہے
مومن ہے سوا وہ ہی جسے بھاوے سوا دال
خوش ہو ہو کے کیا گوشت کے جڑتا ہے نوالے
ایسا نہ ہو ہو جاوے کہیں تجھ سے خفا دال
یہ گوشت تو چولہے میں گیا پہنچے یہ نوبت
اتنا نہ رہے کھائے جو ٹکڑے سے لگا دال
کیوں زاغ و زغن گوشت پہ ماریں نہ جھپٹے
مُردار کا ہو جن کو مزا کھائیں وہ کیا دال
آزاد ابھی ہو جاتے ہیں شاگرد ہم اُس کے
کاغذ کے پتیلے میں جو یوں دیوے پکا دال

آنکھیں

کیا غضب ہیں تری اے ترکِ جفا کار آنکھیں
دو ہی کر دیتی ہیں ہو جاتی ہیں جب چار آنکھیں

ہم نہ کہتے تھے کہ کھو دے گا دلِ زار آنکھیں
یاں تلک رویا کہ آخر ہوئیں بے کار آنکھیں

اپنے ہاتھوں سے نکالوں گا میں لے یار آنکھیں
اب نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہگار آنکھیں

رُخِ رنگیں کی ہوں یاد میں خوں بار آنکھیں
میرے دامن کو کریں دامنِ گلزار آنکھیں

چشمِ کافر میں نشہ کے جو ہیں ڈورے ساقی
کیا بھلی لگتی ہیں پہنے ہوئے زُنّار آنکھیں

آمد آمد ہے یہ کس یوسفِ مصری کی آج
سرِ بازار بچھاتے ہیں خریدار آنکھیں

بند ہو جائے گی پھر مملکتِ دِل کی خبر
کہہ دو توڑیں نہ کہیں آنسوؤں کا تار آنکھیں

دیں جو تلخابۂ غم مجھ کو تو ہے عین کرم
دیتی ہیں ورنہ کسے شربتِ دیدار آنکھیں

طوطے کی طرح سے دل لے کے بدل جاتے ہیں
کیا ہی عیّار ہیں رکھتے بُتِ عیّار آنکھیں

چشمِ نرگس کو بھی گلشن میں بڑے دعوے ہیں
تم ذرا چل کے دکھا دو سرِ گلزار آنکھیں

نہیں کرتے جو مسیحائی ہماری نہ کرو
پر تم اپنی تو خبر لو کہ ہیں بیمار آنکھیں

تم ذرا برقِ نگہ کا جو اشارہ کر دو
گھر کے ہو جائیں ابھی ابرِ گہربار آنکھیں

دِل اُڑانا ترا اور اُن کا مکر جانا صاف
کرتی آنکھوں میں ہیں گھر کیا تری عیار آنکھیں

دخترِ رز ہے جو بے طرح تو بے طرح سہی
تاک بیویں گی کوئی اور طرح دار آنکھیں

آبرؔ سیو کبھی او حسن کے نیساں یہاں بھی
مدتوں سے ہیں کھُلی تشنۂ دیدار آنکھیں

کوئی اُس سامریِ عصر سے جا کر یہ کہو
کہ ترے نرگسِ جادو کی ہیں بیمار آنکھیں

ذرۂ التاج میں تو ان کو لگا اے شہِ حسن
دیکھ تو لائی ہیں کیا کیا دُرِ شہوار آنکھیں

آنکھ کی خوش نظری ہے کہ ہو تو نورِ نظر
جب نظر ہی نہیں ان میں تو ہیں بیکار آنکھیں

سچ ہے اک جا پہ بہم کیونکہ رہیں دو بیمار
میرا بیمار ہے دل، ان کی ہیں بیمار آنکھیں

جامِ سرشار سے اس بزم کو کر دے سرشار
تو بھی سرشار ہے ساقی تری سرشار آنکھیں

خوں ٹپکتا ہے پڑا تیغِ نگہ سے تیری
کیا ہی خوں ریز ہیں ظالم تری خونخوار آنکھیں

آپ کی میری سرِ بزم لڑائی ہو گی
جا کے غیروں سے لڑا یا نہ کرو یار آنکھیں

دیکھے کس طرح سے کوئی تجھے اے پردہ نشیں
کر دکھاتی ہیں تری روزنِ دیوار آنکھیں

ہائے حسرت نہ بر آئی کبھی دل کی آزاد
ساتھ ہی لے کے چلیں حسرتِ دیدار آنکھیں

غزل

جو نالوں سے مرے دل کے تہ و بالا جہاں ہوتا
تو پھر نیچے زمیں ہوتی نہ اوپر آسماں ہوتا

بلا سے دشمنِ جانی مرا سارا جہاں ہوتا
کسی صورت سے اے جانِ جہاں تو جانِ جاں ہوتا

بغل میں گل کے بلبل شاخِ گل پر آشیاں ہوتا
جو ہوتا دوست گلچیں، یار اپنا باغباں ہوتا

تماشا جاں نثاری کا تجب تم دید کے قابل
کہ بے جاں نیمچے سے تیرے تیرا نیم جاں ہوتا

یقیں ہے گر دلِ نالاں مرا اک جا مکیں ہوتا
تو جس جا ہے مکیں ہوتا وہاں برپا مکاں ہوتا

تمہارے بید لوں کی خاک اگر صرفِ چمن ہوتی
تو ہر اک شاخِ گل پر جائے غنچہ دل عیاں ہوتا

جو کوئی چوٹ دل کی ساتھ شیشے کے اثر کرتی
تو جائے آب پر چشمہ سے شیریں خوں رواں ہوتا

دلِ نالاں جرس کی طرح آجاتا ہے جنبش میں
رواں سینے سے جب ہے آنسوؤں کا کارواں ہوتا

جو محنت گاہِ دنیا میں نہ ہوتی موت کی فرصت
تو عاقل صرف آسائش نہ یاں ہوتا نہ واں ہوتا

صنم ہے گردشِ عالم نگاہِ مہر سے تیری
اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا

خدا کے واسطے آزاد روکو نالۂ دل کو!
کہ کوئی آن میں کون و مکاں ہے لامکاں ہوتا

غزل

ہم نے سنا کہ آپ نے ہم کو برا کہا
ہم نے کہا کہ دوست سے جو کچھ کہا، کہا

میں نے جو کچھ کہا سو بخوفِ خدا کہا
مانو مرا کہا کہ نہ مانو مرا کہا

وہ کون ہے کہ ہم کو نہ جس نے برا کہا
پوچھو تو خامشی سے بھلا ہم نے کیا کہا

صورت کو تری دیکھ کے نامِ خدا کہا
کافر صنم بتا تو بھلا کیا برا کہا

اس بت کو دوستوں نے ہمارے غلط کہا
ہم نے بھی گر خدا ہی کہا پھر تو کیا کہا

ہوتے صبا یہ کیوں ہو خفا کیا گنہ کیا
اک آشنا سے گر سخنِ آشنا کہا

زاہد کا جو تھا وعظ وہ تھا پیٹ کے لیے
اک مسئلہ نہ تھا کہ جو بہرِ خدا کہا

ناصح کا جو سخن تھا سو دل کے خلاف تھا
ظالم نے ایک حرف نہ گوش آشنا کہا

خاک اُڑیں گے عقل کے میدانِ طبع میں
پھر توسنِ جنوں کو جو بادر ہوا کہا

دل ہے اگر یہ عالمِ معنی تو ایک ہے
منہ سے صنم کسی نے کہا یا خدا کہا

شبنم کے موتی صبح پہ رولے بگوشِ گل
میرا بھی حال تھا کبھی بادِ صبا کہا

آزاد بزم دہر میں کہتے ہیں جس کو شعر
بلبل نے ہے چمن میں اسے زمزمہ کہا

کتابیات

(۱) تصانیف آزاد

1۔ نصیحت کا کرن پھول (لڑکیوں کے لیے) تالیف 1864ء طبع ثانی 1917ء۔
2۔ قصص ہند (حصہ دوم) لاہور 1872ء طبع جدید لاہور 1961ء
3۔ نگارستانِ فارس (تالیف مابین 1867-1872) 1922ء میں اُن کے پوتے آغا طاہر نے شائع کی۔
4۔ سخندانِ فارس (دوسرا حصہ) 1877ء میں ترتیب دیا 1887ء میں ترمیم کی اور ان کے بیٹے آغا محمد ابراہیم نے 1907ء میں شائع کیا۔
5۔ نیرنگِ خیال (تالیف 1879ء) طبع ثانی 1883ء۔
6۔ نظمِ آزاد۔ آغا محمد ابراہیم نے 1897ء میں شائع کیا۔ طبع سوم 1926ء
7۔ آبِ حیات۔ 1881ء میں شائع ہوئی۔
8۔ قندِ پارسی (تالیف 1880 - 1881) اس کا مسودہ ایران لے گئے تھے۔ وہاں حاجی محمد نے نظرِ ثانی کی 1907 میں شائع ہوئی۔
9۔ جامع القواعد 1885 میں چھپی۔
10۔ دربارِ اکبری 1862 سے 1887 تک لکھی گئی 1898 میں شائع ہوئی۔
11۔ دیوانِ ذوق۔ طبع اول 1890 طبع دوم 1922ء
12۔ لغتِ آزاد۔ ایران سے واپسی پر 1887 میں ترتیب دی اور آغا طاہر نے 1824 میں لاہور سے شائع کی۔
13۔ ڈراما اکبر 1888 میں نامکمل لکھا تھا 1906 میں رسالہ مخزن میں شائع ہوا 1922 میں ناصر نذیر دہلوی نے مکمل کیا اور لاہور سے شائع کیا۔
14۔ آموزگارِ پارسی، تالیف 1887ء
15۔ مکتوباتِ آزاد۔ مخزن پریس لاہور 1907ء مرتبہ سید جالب دہلوی۔ طبع ثانی 1923۔
16۔ سنینِ اسلام، ڈاکٹر لائٹنر (LEITNER) کے ساتھ تالیف کی
17۔ جانورستان۔
18۔ رسائلِ سپاک و نماک، لاہور 1926ء
19۔ فلسفۂ الہیات۔ لاہور 1926ء
20۔ خمکدۂ آزاد۔ قطعات و غزلیات وغیرہ۔ دہلی 1930ء۔
21۔ سیرِ ایران۔

22 - اُردو کی پہلی کتاب (سلسلۂ قدیم)
23 - اُردو کی دوسری کتاب (سلسلۂ قدیم)
24 - فارسی کی پہلی کتاب
25 - فارسی کی دوسری کتاب
26 - اُردو کی پہلی کتاب
27 - اُردو کی دوسری کتاب
28 - اُردو کی تیسری کتاب
29 - اُردو کی چوتھی کتاب
30 - ترجمہ مرکب انٹرنس کورس (انگریزی)
31 - اُردو قواعد
32 - فارسی قواعد
33 - ترکی قواعد
34 - عربی قواعد
35 - قواعد فارسی برائے مڈل اسکول۔
36 - آئینۂ صحت
37 - کائنات عرب
38 - تذکرۂ علماء
39 - حکایاتِ آزاد
40 - شہزادہ ابراہیم کی کہانی
41 - جغرافیہ پنجاب
42 - بیاضِ آزاد
43 - سیرِ ایران

(2) دوسری کتابیں:

1 - تاریخ ادب اُردو، رام بابو سکسینہ
2 داستانِ تاریخ اُردو، مولفہ حامد حسن قادری
3 - سیر المصنفین، محمد یحییٰ تنہا
4 - محمد حسین آزاد (دو جلدیں)، ڈاکٹر اسلم فرخی (انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ کراچی۔
5 - محمد حسین آزاد، جہاں بانو نقوی (حیدرآباد دکن ۱۹۴۰)

(3) رسائل:

1 - اورینٹل کالج میگزین۔ فروری 1939 مئی 1962 فروری 1961 -
2 - نقوش (لاہور) شخصیات نمبر
3 - نقوش (لاہور) آپ بیتی نمبر، حصہ دوم
صحیفہ (لاہور) دسمبر 1957 -

⁂ ⁂ ⁂

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

اقبال اور بچوں کا ادب

مصنفہ: زیب النساء بیگم

صفحات: 216

قیمت:-/60 روپے

بچوں کے حالی

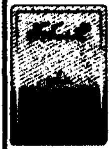

مرتبہ: صالحہ عابد حسین

صفحات: 63

قیمت:-/14 روپے

پریم چند

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

صفحات: 69

قیمت:-/31 روپے

رتن ناتھ سرشار: حیات، شخصیت اور کارنامے

مصنف: پریم پال اشک

صفحات: 108

قیمت:-/17 روپے

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مصنف: ڈاکٹر ہارون ایوب

صفحات: 144

قیمت: -/12 روپے

ہمارے نبی

مصنف: صفدر حسین

صفحات: 112

قیمت:-/15 روپے

ISBN : 978-81-7587-359-9

9 788175 873599

क़ौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area

Jasola, New Delhi-110025